مجلس ادارت

۱۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی ۲۔ ڈاکٹر نذیر احمد

۳۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی ۴۔ ضیاء الدین اصلاحی

معارف کا زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپے فی شمارہ پانچ روپے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا ــــــ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۵۴ ماہ ربیع الثانی ۱۴۱۵ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۹۴ء عدد ۳

مضامین

شذرات

انگریزوں کے زمانے ہی میں بہار و اڑیسہ میں امارت شرعیہ کا قیام عمل میں آگیا تھا اور اسکے دارالقضا سے شرعی قوانین کے مطابق مسلمانوں کے مقدمات طے ہوتے تھے، اب بھی امارت شرعیہ کا یہ نظام قائم ہے اور اس سے مسلمانوں کو بڑی راحت و سہولت ہے کیونکہ سرکاری عدالتوں میں انصاف بکتا ہے اور معمولی مقدمات کے تصفیہ ہونے تک عدالت سے رجوع کرنے والا مرچکا ہوتا ہے اور اس طویل عرصہ میں وقت اور روپے کے ضیاع کے علاوہ ذہنی اذیت اور ناقابلِ بیان پریشانیاں پیش آتی ہیں ابھی تک امارت شرعیہ کے دارالقضا کے خلاف کوئی آواز سننے میں نہیں آئی تھی اور نہ اسے کوئی متوازی نظام کہا گیا تھا بلکہ چند برس پہلے امارت کے زیرِ انتظام قائم ہونے والے "سجاد اسپتال" کی افتتاحی تقریب میں اُس وقت کے وزیرِ اعلیٰ بہار مسٹر بھگوت جھا آزاد نے کہا "ہمیں تعجب ہے کہ پھلواری شریف کے دارالقضا نے ستر ہزار سے زائد فتوے اور فیصلے کیے ہیں اور ہماری ٹریجڈی ہے کہ لوور کورٹ، ڈسٹرکٹ کورٹ، ہائی کورٹ، سپریم کورٹ کے فیصلے تک انصاف پانے والا جاتے جاتے مرجاتا ہے" یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بہار کی سرکاری عدالتیں دارالقضا کے فیصلوں کو اہمیت دیتی ہیں اور انکا احترام کرتی ہیں۔

بہار میں دارالقضا کے کامیاب تجربہ کی بنا پر گزشتہ سال آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اپنے اجلاس منعقدہ جے پور میں فیصلہ کیا کہ پورے ملک میں مسلمان دارالقضا قائم کریں جس کے خلاف شدید ردِ عمل ہوا مگر مسلم پرسنل لا کے فیصلہ کے خلاف شور و غوغا برپا کرنے والوں نے گاؤں پنچایت، لوک عدالت اور پنچایتی راج پر کبھی ہنگامہ و احتجاج نہیں کیا اور نہ اسے عدلیہ کے خلاف متوازی نظام کہا جب کہ ان سب کا مقصد و منشا بھی یہی ہے کہ عام لوگوں کے لیے انصاف سستا اور آسان ہو جائے اور گاؤں والے اپنے جھگڑے کسی پریشانی اور زیر باری کے بغیر خود ہی چکا لیں، اگر پنچایتی راج سے کسی متوازی نظام کے قائم ہونے اور لوگوں کے قومی دھارے سے الگ ہو جانے کا اندیشہ نہیں ہے

تو مسلمانوں کے دارالقضا کے قیام سے کون سی قیامت برپا ہو جائے گی۔

ہم کو نہ اسباب سے بحث ہے اور نہ ہم پنچایتی راج کو غیر مفید اور غیر مناسب کہتے ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کے بطن سے گوناگوں خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں، ہر گاؤں رزم گاہ میں تبدیل ہو گیا ہے، لوگوں کے جھگڑے کم ہونے کے بجائے بڑھ گئے ہیں، ہر جگہ ٹکراؤ، تصادم، محاذ آرائی اور خون خرابہ ہو رہا ہے، اس کے برخلاف دارالقضا کے قیام سے معاشرہ میں انتشار و فساد کم ہوا ہے، امن و امان کو فروغ ملا ہے، انصاف کا حصول سستا اور آسان ہوا ہے، مقدمات کے فیصلے جلد ہوئے ہیں، وقت اور پیسے کی بربادی نہیں ہوئی اور لوگ زیر بار ہونے سے بچ گئے، کیا یہ ساری چیزیں ملک کے مفاد کے خلاف اور اسکی جمہوریت کے لیے ضرر رساں ہیں، یا ملک کی بھلائی اور ترقی کی ضامن اور جمہوریت کی شہرت و نیک نامی کا باعث ہیں۔

حق کی پامالی، عدل کی بربادی اور انصاف کی نایابی عام ہو گئی ہے اور خدا کی زمین شر و فساد سے معمور ہو گئی ہے، شریف اور معزز لوگوں کا رہنا اور جینا دوبھر ہو گیا ہے، غنڈے بدمعاش اور جرائم پیشہ لوگ ہر جگہ دندناتے پھر رہے ہیں، افراد تو افراد جماعتوں کا قتل دن دھاڑے ہوتا ہے اور امن و قانون کے ذمہ دار مجرموں کا پتہ لگانے میں ناکام رہتے ہیں، ان کی موجودگی میں مال و اسباب لوٹا جاتا ہے، اجتماعی عصمت دری ہوتی ہے، مساجد و معابد مسمار کر دیے جاتے ہیں اور یہ خود بلوائیوں اور عادی مجرموں کے ساتھ لوٹ مار اور بدکاری میں شریک ہو جاتے ہیں، ایک سے بڑھ کر ایک ظلم ہوتا ہے مگر مظلوموں کی دادرسی تو درکنار پولیس نہ ان کی رپورٹ درج کرتی ہے اور نہ انہیں کوئی گواہ ملتا ہے، کہ سچ کہنے پر زبان کٹتی ہے، دوسری طرف بے گناہوں اور بے خطا لوگوں کو جھوٹے اور فرضی مقدمات میں پھانس دینا اور انہیں طرح طرح سے دق کرنا پولیس کا شعار بن گیا ہے، سرکاری دفاتر اور عدالتیں رشوت اور بدعنوانی کا اڈہ ہیں، وہاں سے عدل و انصاف کے تقاضے پورے ہونے کی توقع ہی اٹھ گئی ہے، کرپشن، چوری، بلیک مارکٹنگ، گھپلے اور اسکینڈل میں ذمہ دار لوگ یا تو خود ملوث

ہوتے ہیں یا ملوث لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی کرنے میں بے بس رہتے ہیں ان حالات میں عدل و انصاف کو فروغ دینے والے قابل تحسین ہیں نہ کہ لائق سرزنش وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحاً۔

اس کی بھی صفائی اور وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مسلمان اللہ کی طرف سے عدل و انصاف کے قیام، حقوق کی حفاظت اور ظلم و طغیان اور شر و فساد کے انسداد پر مامور ہیں، ان کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ حق و قسط پر خود بھی جمے رہیں اور ساری دنیا کے سامنے اس کی گواہی دیں، چاہے وہ خود انکے اور انکے رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ پڑے، کسی قوم کی عداوت انہیں عدل کا شیوہ اختیار کرنے سے باز نہ رکھے، اگر انکے ہاتھوں میں زمام کار ہو تو وہ لوگوں کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ فیصلے کریں، انکی نگاہ میں امیر و غریب اور شریف و وضیع کا فرق نہ رہے، انصاف کی خرید و فروخت نہ ہونے دیں، زور و اثر، خوف و طمع اور دباؤ میں نہ آئیں، انکے ایمان کا اعتبار اسی وقت ہوگا جب وہ خدا کے رسولؐ کو اپنی منازعات میں حَکَم بنالیں اور اسکے فیصلے کو بے چون و چرا مان لیں، جاہلیت کے فیصلوں کے طالب نہ بنیں اور خدا کو چھوڑ کر کسی اور کے پاس اپنے معاملات نہ لے جائیں کیونکہ اللہ کے فیصلے سے زیادہ بہتر اور اچھا کسی کا فیصلہ نہیں ہے، مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ کے قانون کو نافذ و جاری کرنے ہی سے حق و انصاف کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں اور شرعی نظام قضا ہی سے مسلمانوں کی زندگی اسلامی بنیادوں پر منظم و مستحکم ہو سکتی ہے۔

یہی وہ پس منظر ہے جس میں دار القضا کے قیام کا فیصلہ کیا گیا تھا تاکہ مسلمانوں کی زندگی، معاشرت اور رہن سہن میں شرعی قانون کی پابندی ہو سکے اور شاہ بانو وغیرہ کے واقعات کا اعادہ نہ ہو، مسلمان اپنے ملک کے وفادار اور اس کے آئین و قانون کے پابند ہیں لیکن وہ اپنے عقیدے میں اپنی عبادات میں پرسنل لا میں معاشرت اور معیشت میں خدا کے قانون اور ضابطہ کے مطابق زندگی گزارنا چاہتے ہیں تاکہ انکا وجود ان کے لیے بھی اور انکے ملک کے لیے بھی موجب خیر و برکت ہو۔

مقالات

چند قومی مرثیے

از پروفیسر نذیر احمد۔ علی گڑھ

[حال ہی میں راقم الحروف نے فارسی قصیدہ نگاری پر ایک کتابچہ غالب انسٹی ٹیوٹ سے شایع کیا ہے، اس میں فارسی قصیدہ کی حمایت میں گفتگو کی گئی ہے، مجھے فارسی قصیدہ گوئی کافی پسند ہے، اس پسند کی بنیاد قصیدہ گوئی کی وہ خصوصیات ہیں جو فارسی کے دوسرے اصناف سخن میں نہیں پائی جاتی ہیں۔ البتہ اس کتابچہ میں فارسی قصیدہ گوئی کی ایک خصوصیت کا تذکرہ نہیں ہو سکا تھا اور وہ یہ ہے کہ یہی وہ صنف سخن ہے جس کے ذریعے قوموں میں نئی روح پھونکی جا سکتی ہے اور حق یہ ہے کہ فارسی شاعروں نے یہ حق بجا طور پر ادا کر دیا ہے، جب قوموں پر بڑے حادثات پیش آتے ہیں اور وہ مصائب سے دوچار ہوتی ہیں تو شاعر چونکا دینے والے قصائد لکھ کر لوگوں میں بیداری کی لہر پیدا کر دیتے ہیں۔ فارسی شاعروں نے قصیدوں کے ذریعے عوامی مصائب کا تذکرہ متاثر انداز میں کیا ہے، وہ قومی مرثیے ہیں، جن پر صدیاں گزر چکی ہیں، پھر بھی انکی افادیت باقی ہے۔

میں نے قصیدے سے طویل اقتباس نقل کر دیے ہیں، جو شاید مستحسن نظروں سے نہ دیکھے جا سکیں، اس ضمن میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہماری آنکھیں غزل کے ایک آدھ شعر کی مثالیں دیکھنے کی عادی ہیں، قصیدے کے اشعار ان کی طبع پر گراں گزرتے ہیں، لیکن حق یہ ہے کہ قصیدے کے اقتباس کے بغیر وہ کیفیت پیدا ہی نہیں ہو سکتی

جو قصیدے کا اصل مقصود ہے۔] نذیر احمد

قومیں جب بڑے واقعات و حادثات سے دوچار ہوتی ہیں تو قدرتی بات ہے کہ ان کے افراد بہت متاثر ہوتے ہیں، ان میں سب سے زیادہ شاعر اثر قبول کرتے ہیں اس لیے کہ وہ بہت حساس واقع ہوئے ہیں اور وہ اپنے اشعار میں اسی احساس کا رنگ بھرتے ہیں، آج کل کی بھی شاعری خصوصاً اردو شاعری اسی طرح کے جذبات و احساسات سے پُر ہوتی ہے، اس مختصر مقالے میں تاریخ کے دو بڑے واقعات کے تعلق سے چند نظموں کے بارے میں ایک گزارش پیش کی جارہی ہے۔ ان میں ایک خراسان کے زبردست حادثے سے متعلق اور دوسرے کا تعلق ہلاکو کے ہاتھوں بغداد کی تباہی سے ہے۔ خراسان کے واقعہ کا خلاصہ یہ ہے۔

سلطان سنجر سلجوقی خاندان کا بڑا فرمانروا گذرا، ۵۱۱ھ/۱۱۱۷ء میں تخت نشین ہوا، ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء میں ۴۰-۴۱ سال کی حکومت کے بعد فوت ہوا، کہا جاتا ہے کہ اس نے ۱۹ لڑائیوں میں فتح حاصل کی، لیکن اس نے قراختائیوں سے[1] ایک زبردست جنگ میں شکست کھائی جس میں اس کے ایک لاکھ آدمی مارے گئے، سنجر نے علاء الدین جہاں سوز غوری کو شکست دی اور اس کو اسیر کرلیا۔ اسی دوران ترکوں کے ایک خانہ بدوش خانوادے یعنی غزوں نے رود جیحوں کو پار کرلیا اور سنجر نے انہیں درۂ بلخ کے نواح میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت دیدی اس شرط کے ساتھ چالیس ہزار بھیڑ ہر سال بطور خراج حکومت کو دیا کریں گے، لیکن کچھ دنوں بعد اس مسئلے پر

[1] صفا کے بقول (تاریخ ادبیات ۲:۱۴۰) ۵۳۶ھ میں قراختائیوں سے سنجر نے بمقام قطوان شکست کھائی، لیکن معین نے قطوان کی جنگ غزوں سے ۵۴۸ھ میں بتائی ہے، جو صحیح نہیں معلوم ہوتی۔

اختلاف ہوا، حاکم بلخ اس کو حل نہ کرسکا تو سنجر ان کی سرکوبی کے لیے ۵۴۸ھ میں ایک لشکر جرار کے ساتھ روانہ ہوا، غزوں نے بڑی بے جگری سے سنجر کے لشکر سے لڑائی کی اور آخر کار سنجر کو شکست ہوئی اور سلطان اسیر ہوگیا، ۴ سال غزوں کی قید میں رہا۔ پھر ایک حیلہ سے نکل بھاگا۔ یہ ۵۵۱ھ کا واقعہ ہے، جب دارالخلافہ مرو پہنچا تو شہر کو ویران پایا، اس سے وہ ایسا دل شکستہ ہوا کہ زندگی سے بیزار ہوگیا اور ۵۵۲ھ[1] میں ۷۲ سال کی عمر میں فوت ہوا۔

سنجر نہایت علم دوست حکمراں تھا، اس کا دربار علماء و فضلاء اور شعرا کا ملجا و ماویٰ تھا، فارسی کا مشہور قصیدہ گو شاعر انوری خراسانی (۵۸۳ھ) اس کے دربار سے وابستہ تھا۔ غزوں کے ہاتھوں جب سنجر کو شکست ہوئی تو سارا خراسان زبردست مصیبت سے دوچار ہوا، غزوں کے مظالم کی داستان بہت غمناک ہے، شہر، آبادی، مساجد، معابد سارے ویران کر ڈالے گئے، اور ویرانی کا حال یہ تھا کہ سنجر جب قید سے نکلا تو اس ویرانی کی تاب نہ لاکر فوت ہوگیا، خراسان کی بربادی عالم اسلام کا دل سوز واقعہ تھا، اس لیے کہ خود خراسان عالم اسلام کا دل تھا، خاقانی نے اس کی مدح میں ایک طویل قصیدہ لکھا ہے جس میں اس کی بربادی کا ذکر ہے، اس حملہ میں جو اہل علم شہید ہوئے، ان میں امام محمد یحییٰ بھی تھے، ان کے لیے خاقانی نے متعدد قصیدے لکھے

[1] صفا نے تاریخ وفات یہی دی ہے اور مدت حکومت ۶۱ سال (ایضاً ۱۵) بتائی ہے جس میں ۱۱ سال اس کی امارت خراسان بھی شامل ہے۔ سنجر کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے، راحۃ ۱۸۵ھ ۴۸، ایضاً ۵۵۱ھ، زبدۃ النصرۃ ۲۵۵، ۴ ربیع الاول ۵۵۲ھ اور ابن اثیر نے دیکھا ہے میں پیدائش ۴۷۹ھ، مدت عمر ۷۲ سال چند ماہ، مدت بادشاہی ۶۱ سال، ۴۰ سال، ملک خراسان ۴۱ سال سلطنت جہاں۔

(دیکھئے مقدمہ ۴۵-۴۶)

اسی صورتِ حال میں انوری نے ایک منظومہ خاقان سمرقند رکن الدین قلیج طمغاج خاں کے نام پر لکھا۔ یہ نظم ایک دل سوز مرثیہ ہے جو اہل خراسان کی زبان سے خاقان سمرقند کی خدمت میں پیش ہوا تھا، قلیج طمغاج خاں سلطان سنجر کا بھانجا تھا، اس کا لقب محمود خاں بن ارسلان خاں محمد بن سلیمان خاں تھا، وہ سنجر کی طرف سے ماوراء النہر کا حکمراں تھا، جب ۵۴۸ میں سلطان سنجر غزوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا تو امرائے سنجری نے ملک شاہ کے پوتے سلیمان شاہ کو تخت پر بٹھایا، لیکن ایک ہی سال کے اندر اس نے حکومت سے استعفا دے دیا تو پھر قلیج طمغاج خاں کو تخت نشین کرایا، اس نے سنجر کے زمانہ اسیری (۵۴۸-۵۵۱) میں حکومت کی، ۵۵۲ میں سنجر کی وفات پر تخت نشین ہوا، لیکن غزوں کے مقابلے میں وہ کچھ نہ کر سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سلجوقی امیر موید ای ابہ نے اس کی اور اس کے بیٹے کی آنکھ میں سلائی پھروا دی اور ۵۵۷ میں قلیج طمغاج کا انتقال ہو گیا۔ سلجوقی حکومت کی کمزوری سے غزوں کا دباؤ پورے خراسان اور کرمان تک پھیل گیا۔

غز بھی سلجوقیوں کی طرح ترک تھے۔ جن کے اکثر قبیلے خانہ بدوش تھے، گلہ بانی ان کا پیشہ تھا۔ سلجوقیوں کے زمانے میں دوسرے قبائل کے دباؤ کی وجہ سے یہ خراسان کے علاقہ میں پھیل گئے اور بلخ کے نواح میں سکونت اختیار کر لی۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے سلطان سنجر کے مقرر کردہ حاکم بلخ امیر قماج سے انکا اختلاف ہوا تو انھوں نے قتل و غارت اور عورتوں اور بچوں کا اغوا شروع کر دیا اور علماء اور فضلاء کے ایک گروہ کو قتل کر ڈالا، اس کے نتیجے میں سلطان سنجر نے ان پر حملہ کیا،

شکست کھائی اور قید ہو گیا۔ اس کے بعد تو پورا خراسان ان کی غارتگری اور بہیمیت کا شکار ہو گیا۔ شہر نیشاپور کو جلا کر ویران کر دیا، طوس بھی اسی طرح کی بربادی کا شکار ہوا، سیکڑوں علماء و فضلاء، شعرا قتل ہوئے، مساجد، معابد ویران ہوئے، عورتوں کا اغوا ہوا، یہ تو نہ ہوا کہ غز غارتگر اپنی الگ حکومت قائم کر سکتے، لیکن ان کی غارتگری خراسان سے لے کر کرمان اور مکران تک پھیل گئی۔ ساتویں صدی کے ایک شاعر نے مکران کے دو[2] فرمانرواؤں تاج الدین ابوالمکارم خسرو و سلطان نصرت الدین ابوالخطاب خسرو کے غزوں سے معرکہ کا ذکر ان اشعار میں کیا ہے۔

بہ پیش لشکر تو سنگ پست آمد چو حرف جر — سپاہی چون سپاہ تو بچنین جرار کی باشد
حصار سنگ را تو می ہمی کردند حصاری — حصار عنکبوتی را مگس حصار کی باشد
مبارکباد فتح سنگ و غز مقہور پیش تو — کہ قہر لشکر غز را چو تو قہار کی باشد (دیوان سراجی ص ۹۸)
بہ پیش لشکرت شاہا حصار سنگ پست آمد — بشکل قلعہ گردون اگر حصن حصین استی
حصارش کی شدی کندہ سپاہش کی شدہ کشتہ — زن و فرزند او ہم کہ بدست آن دواستی
مبارکباد فتح سنگ و غز مقہور پیش تو — دعا می بیگمانست این کہ آمیزش بیقینستی (ص ۲۸۶)

غزوں کا فتنہ خوارزمشاہیوں کے تسلط سے کرمان اور مکران کے سلاطین کے اثر سے بھی رفع ہوا۔

اب انوری کے مرثیہ کے اشعار ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں، ساتھ ہی سہولت کی خاطر ان کا ترجمہ بھی دیا جا رہا ہے۔

بہ سمرقند اگر بگذری ای باد سحر — ای باد سحر اگر تیرا گذر سمرقند سے ہو تو

---

[1] طبع مدرس رضوی ص ۲۰۱ ببعد۔

نامهٔ اہل خراسان بسبر خاقان بر

خاقان سمرقند کی خدمت میں اہل خراسان کا یہ خط پہنچا دے۔

نامهٔ مطلع آن رنج تن و آفت جاں
نامهٔ مقطع آن درد دل و سوز جگر

ایسا دردبھرا خط ہے جس کا مطلع رنجِ تن اور آفتِ جاں ایسا خط جس کا مقطع دردِ دل اور سوزِ جگر ہے۔

نامهٔ بر رقمش آہ عزیزان پیدا
نامهٔ در شکنش خون شہیدان مضمر

ایسا خط جس کی تحریر عزیزوں کی آہ سے پُر ہے' ایسا خط جس کی شکن شہیدوں کے خون سے آلودہ ہے۔

نقش تحریرش از سینهٔ مظلومان خشک
سطر عنوانش از دیدهٔ محرومان تر

تحریر کا نقش مظلوموں کے سینہ کی گرمی سے خشک ہوا ہے' اور عنوان کی سطر محروموں کے آنسوؤں سے تر ہوئی ہے۔

ریش گردد ممر صوت از و گاہ سماع
خون شود مردمک دیده از و وقت نظر

(دردناک واقعات) سنتے وقت آواز کی گذرگاہ زخمی ہو جاتی ہے' المناک منظر دیکھنے سے آنکھ کی پتلی خون ہو جاتی ہے۔

تاکنوں حال خراساں و رعایا بودست
بر خداوند جہاں خاقان پوشیدہ مگر

شاید اب تک خراسان اور وہاں کے شہریوں کے حالات خداوندِ جہان خاقان پر پوشیدہ ہیں۔

نی نبودست کہ پوشیدہ نباشد بروی
ذرۂ نیک و بد نه فلک و هفت اختر

نہیں نہیں ان پر کیوں یہ حالات پوشیدہ ہونگے، وہ تو ایسے ہیں کہ نو آسمان اور

ساتوں سیاروں کے تعلق سے کوئی اچھی بری چیز پنہاں نہیں۔

کار با بستہ بود بیشک در وقت و کنون
وقت آنست کہ راند سوی ایران لشکر

اس وقت بیشک کام رُکے ہونگے' اب وقت آگیا کہ خاقان معظم ایران کی طرف لشکر بھیجیں۔

خسرو عادل خاقان معظم کز جد
پادشاہست و جہاندار بہ ہفتاد و پدر

وہ خسرو عادل ستر پشت سے بادشاہ رہے ہیں۔

دایمش فخر بآنست کہ در پیش ملوک
پسرش خواند ہی سلطان سلاطین سنجر

وہ ہمیشہ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ باشاہوں کے سامنے سلطان سلاطین سنجر نے ان کو منہ بولا بیٹا کہا ہے۔

باز خواہد ز غزان کینہ کہ واجب باشد
خواستن کین پدر بر پسر خوب سیر

وہ غزوں سے ضرور بدلا لیں اس لیے کہ باپ کے دشمن سے بدلہ لینا نیک بیٹے پر واجب ہوتا ہے۔

چون شد از عدلش سرتاسر توران آباد
کی روا دارد ایران را ویران یکسر

جب ایسے فرمانروا کے عدل کی بدولت پورا توران آباد و سرسبز ہو گیا، وہ ایران کو تباہ و برباد کیونکر دیکھ سکتے ہیں۔

ای کیومرث بقا پادشہ کسری عدل
وی منوچہر لقا خسرو افریدون فر

اے بادشاہ جس کی حکومت کیومرث کی طرح باقی رہنے والی اور جو اپنے عدل کے اعتبار سے نوشیرواں ہے اور اسے منوچہر

جیسی دلکشی رکھنے والے اے فریدون کی
طرح شان و شوکت رکھنے والے خسرو۔

قصۂ اہل خراسان بشنو از سر لطف
چون شنیدی ز سر رحم بایشان بنگر
ایں دل افگار جگر سوختگان می گویند
کای دل و دولت و دین را بتو شادی و ظفر

از راہ کرم اہل خراسان کے واقعات سُنیے
اور جب سُن لے تو رحمت کی ان پر نگاہ ڈالے۔
یہ دل خستہ اور جگر سوختہ لوگ تجھ سے اس
طرح مخاطب ہیں کہ اے بادشاہ کہ تیرے
وجہ سے دل، دولت اور دین سب خوش
ہیں اور اپنے کو شکست خوردہ نہیں سمجھتے۔

خبرت ہست کہ از ہر چہ در و چیزی بود
در ہمہ ایران امروز نماندست اثر

کیا آپ کو کچھ خبر ہے کہ سارے ایران کی جو
عزیز چیز تھی اسکا کوئی نشان باقی نہیں۔

خبرت ہست کزین زیر و زبر شوم غزان
نیست یک پی ز خراسان کہ نشد زیر و زبر

کیا تجھے خبر ہے کہ ان بدذات غزوں کی
بربادی سے ایک چیز ایسی نہیں جو برباد
نہیں ہوئی۔

بر بزرگان زمانہ شدہ خردان سالار
بر کریمان جہان گشتہ لئیمان مہتر

بڑوں پر چھوٹے سردار ہوئے اور جو خیر
اور مہان تھے ان پر بدذات لوگ حاکم
اور سردار مقرر ہوئے۔

بر در دونان احرار حزین و حیران
در کف رندان ابرار اسیر و مضطر

کمینوں کے دروازوں پر سردار اور عزیز
لوگ غمگین اور حیران پریشان کھڑے ہیں،
ذی وقار حضرات کمینوں کے ہاتھوں

پریشان اور مقید ہیں،

شاد الا بدر مرگ نہ بینی مردم
بکر جز در شکم مام نیابی دختر

کوئی شخص سوائے موت کے دروازے پر شاد
نظر نہیں آتا، کوئی دختر بجز وہ جو ماں
کے پیٹ میں ہے، بکر باقی نہیں۔

مسجد جامع ہر شہر ستوران شان را
پایگاہی شدہ نہ سقفش پیدا و نہ در
خطبہ نکنند بہر خطہ بنام غز از آنک
در خراسان نہ خطیب است کنون نہ منبر

ہر شہر کی جامع مسجد انکے گھوڑوں کی اصطبل ہو گئی
ہے نہ اس کی چھت باقی ہے اور نہ دروازے۔
غزوں کے نام کا خطبہ اس لیے نہیں پڑھا
جا رہا ہے کہ پورے خراسان میں نہ مسجد
کا منبر باقی ہے اور نہ خطیب ہی رہ گئے۔

کشتہ فرزند گرامی را گر ناگاہ بان
بیند، از بیم خروشید نیارد مادر

اگر کوئی ماں اپنے بیٹے کو ناگہاں مقتول
دیکھے تو وہ اس پر رو پیٹ نہیں سکتی۔

بر مسلمانان زان نوع کنند استخفاف
کہ مسلمان نکند صد یک از آن با کافر

مسلمانوں کو ایسا ذلیل و خوار کیا جا رہا ہے
کہ مسلمانوں کی طرف سے کافروں پر اس کا
سواں حصہ بھی نہ ہوا ہوگا۔

ہست در روم و خطا امن مسلمانان را
نیست یک ذرہ سلامت بمسلمانی در

روم اور خطا کے علاقوں میں مسلمان امن
چین سے ہیں، لیکن ایران جو اسلامی
ملک ہے اس میں اسلامتی کا نام و نشان نہیں۔

خلق را زین غم فریاد رس ای شاہ نژاد
ملک را زین ستم آزاد کن ای پاک سیر

اے بادشاہ نژاد فرمانروا، اس غم سے
مخلوق کو نجات دلا، ان کی فریاد رسی کر،

اور اے پاک سیرت ملک کو اس ستم سے آزادی دلا،

بخدائی که بیاراست بنامت دینار
بخدائی که بیفراخت بفرّت افسر

اس ذات پاک کا واسطہ جس نے دینار کو تیرے نام سے منقش کرایا اور جس نے تاج سے تیرے سر کو مزین کیا۔

که کنی فارغ و آسوده دل خلق خدا
زین فرومایه غز شوم پی غارتگر

ان بدذات اور کمینے غزوں سے جو غارتگری پر کمربستہ ہیں، خلقِ خدا کے دلوں کو آسودہ اور مطمئن کر دے۔

وقت آنست که یابند ز رحمت پاداش
گاه آنست که گیرند ز تیغت کیفر

وقت آگیا ہے کہ تیرے نیزے سے انہیں اپنے کیے کا بدلہ مل جائے اور وہ دن دور نہیں کہ تیری تیغ سے وہ اپنے کیے کا مزہ چکھیں،

آخر ایران که ازو بودی فردوس برشک
وقف خواهد شد تا حشر برین شوم حشر

کیا وہ ایران جس پر فردوس کو رشک تھا، قیامت تک ان بدذات غزوں کے لیے وقف ہو جائے گا؟

رحم کن رحم بر آن قوم که نبود شب و روز
در مصیبتشان جز نوحه گری کار دگر

اس قوم پر رحم کر جن کا کام مصیبت میں شب و روز بجز نوحہ گری اور کچھ نہیں۔

رحم کن رحم بر آن قوم که جویند جوین
از پس آنکه نخوردندی از ناز شکر

اس قوم پر رحم کر جو آج نان جویں کو محتاج ہیں جبکہ کل تک ان کی حالت ایسی تھی کہ مارے ناز کے وہ شکر بھی نہیں کھاتے۔

رحم کن رحم بر آنها که نیابند نمد
از پس آنکه ز اطلسشان بودی بستر

اس قوم کی حالت زار پر رحم کر جن کو آج لیٹنے بیٹھنے کے لیے نمدہ بھی میسر نہیں؛ حالانکہ ابھی کل کی بات ہے کہ وہ ریشم کے بستر پر لیٹتے تھے۔

رحم کن رحم بر آن قوم که رسوا گشتند
از پس آنکه بمستوری بودند سمر

اس قوم پر رحم کر جس کے لوگ رسوا ہو کر بازار بازار پھر رہے ہیں؛ حالانکہ عزت و وقار کی وجہ سے وہ گھر سے نہیں نکلتے تھے، اور اس لحاظ سے وہ بہت مشہور تھے۔

از تو رزم ای شه و از بخت موافق نصرت
از تو عزم ای ملک و از ملک العرش ظفر

اے بادشاہ! آپ جنگ پر آمادہ ہو جائیں، قسمت آپ کا ساتھ دے گی اور آپ منصور و فاتح ہوں گے، آپ بس ارادہ کر دیں، ملک العرش آپ کو ظفر دے گا۔

خراسان مشرقی عالم اسلام کے دل کی حیثیت رکھتا تھا، وہ اسلامی علوم و فنون کا بڑا مرکز تھا، اس کی بربادی اسلامی علوم کی بربادی کے مترادف تھی؛ خراسان کے سب سے بڑے مفتی و عالم محمد بن یحییٰ تھے، وہ بھی غزوں کی بربریت کے شکار ہوئے، خاقانی نے ایک طویل قصیدہ میں جو ۱۱۱ ابیات پر مشتمل ہے خراسان کی اہمیت اور مرکزیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہاں ان کو اجمالاً سب کچھ نظر آتا تھا جو عالم اسلام میں تفصیل سے ملتا۔ اس قصیدے میں امام محمد بن یحییٰ کے علم و فضل کا ذکر اور ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے؛ یہاں اس کے صرف چند شعر نقل کیے جا رہے ہیں، قصیدہ کا

عنوان یہ ہے:

ستایش خراسان وتمنای حصول آن و مدح امام محمد بن یحییٰ (۳۹)

رہ پویم مقصد امکان بخراسان یابم
تشنہ ام مشرب احسان بخراسان یابم

میں حصول مقصد کے لیے جا رہا ہوں، ممکن ہے میرا مقصد خراسان میں حاصل ہو، میں پیاسا ہوں، احسان کا مشرب خراسان میں ملے گا۔

دل کنم مجمر سوزان و جگر عود سیاہ
دم آن مجمر سوزان بخراسان یابم

دل جلتی ہوئی بھٹی ہے اور جگر جل کر عود سیاہ ہو گیا، اس جلتی ہوئی بھٹی کی آگ تیز کرنے کی پھونک خراسان میں ملے گی۔

بر کنم شمع وفا را بخراسان طلبم
کان کلید در رضوان بخراسان یابم

شمع جلا رہا ہوں، وفا کی طلب خراسان میں ہو گی، وہ در رضوان کی کنجی ہے جو خراسان ہی میں ملے گی۔

در جہاں بوی وفا نیست وگر ہست اینجاست
کاین گل از خار مغیلان بخراسان یابم۔

دنیا میں بوئے وفا نہیں، اگر کہیں ہے تو خراسان میں ہے، خار مغیلان سے اگر پھول کہیں مل سکتا ہے تو وہ خراسان ہی ہے۔

بسر خاک محمد پسر یحییٰ پاک
روم و رتبت حسان بخراسان یابم

میں امام محمد بن یحییٰ کی خاک پر جاؤں گا اور اس طرح خراسان میں مجھے حسانؓ کا مرتبہ حاصل ہو جائے گا۔

محی الدین کہ سلیمان صفت و خدمش
دیو و انس و ملک و جان بخراسان یابم

محی الدین جو حضرت سلیمانؑ کی صفات کے حامل ہیں، اسی وجہ سے دیو، انس، ملک، جن سب ان کے خادم خراسان میں ملیں گے۔

شافعی بینم در دست و ہر انگشتی از او
مالک و احمد و نعمان بخراسان یابم

وہ امام شافعیؒ کے مانند ہیں اور ہاتھ کی ہر انگلی میں امام مالکؒ، امام احمدؒ اور امام اعظمؒ خراسان میں ملیں گے۔

ہادی امت و مہدی زمان گز قلمش
قمع دجال صفاہان بخراسان یابم

وہ ہادی امت اور مہدی زمان ہیں، ان کے قلم سے صفاہان کے دجال کا قلع قمع خراسان میں ہو گا۔

گوہر افسر اسلام کہ از خاک درش
افسر گوہر سامان بخراسان یابم

وہ اسلام کے تاج کے گوہر ہیں، ان کے دروازہ کی خاک سے جواہرات سے مرصع تاج خراسان میں مجھے ملے گا (میرے قلم سے تیز مضامین جو مُشک کی خوشبو سے معطر ہوں گے نکلیں گے)

دستم از نامۂ او نافہ کشای سخنی است
کاہوی تبت توران بخراسان یابم

ان کے خط کی وجہ سے میرا ہاتھ سخن کا نافہ کشا ہے، توران کے تبت کا آہو خراسان میں مل سکے گا۔

غزّوں کے حملۂ نیشاپور میں شوال ۵۴۹ھ میں ان وحشیوں نے ایسے نابغۂ روزگار کو بڑے دردناک انداز میں شہید کیا، ان کے منہ میں مٹی ٹھونس کر ہلاک کیا، ان کی وفات عالم اسلام کا بڑا سانحہ تھا، اس موقع پر شعرا نے[1] مراثی لکھے اور اس طرح اپنے کرب والم

---

[1] وہ ۴۸۷ھ میں ترشیز (طریثیت) میں پیدا ہوئے، بقول ابن خلکان امام ابو حامد محمد غزالی کے
(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۰ پر)

کا اظہار کیا۔ خود خاقانی جو امام صاحب کا بڑا قدر داں تھا، ان کی شہادت سے بہت متاثر تھا، اس نے چند مرثیے نظم کیے' ایک مرثیے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں: یہ مرثیہ اپنی جگہ پر قومی مرثیہ ہے جس کو انوری کے مرثیے کے بالمقابل رکھا جا سکتا ہے۔

در مرثیہ امام محمد بن یحییٰ و حادثہ حبس سنجر در فتنۂ غز

آں مصر مملکت کہ تو دیدی خراب شد
واں نیل مکرمت کہ شنیدی سراب شد

حکومت کا وہ شہر جو تو نے دیکھا تھا، اجڑ گیا' اور جود و سخا کا نیل جس کے بارے میں تم نے سنا تھا وہ خشک ہو کر سراب میں تبدیل ہو گیا ہے۔

سرو سعادت از تف خذلان زگال گشت
اکنون بر آن زگال جگر ہا کباب شد

نیک بختی کا سرو بربادی کے تف سے جل کر کوئلہ ہو چکا ہے اور اب اس کوئلے پر لوگوں کے جگر کباب ہو گئے ہیں۔

چہل گز سرشک خون ز بر خاک در گذشت
لا بل چہل قدم ز بر ماہتاب شد

چالیس گز خون زمین کے اوپر بہ گیا، بلکہ یوں کہیے کہ چالیس قدم خون ماہتاب کے اوپر جم گیا۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۷) شاگرد تھے' کچھ دنوں نظامیہ بغداد میں درس دیتے رہے' ۵۴۹ میں منگولوں کے ہاتھوں بڑے دردناک انداز میں شہید کر دیے گئے، شاعر بھی تھے' عربی و فارسی دونوں میں شعر کہتے، فارسی کے اشعار لباب الالباب عوفی (چاپ نفیسی ۱۹۰) میں درج ہیں۔ انکی وفات پر خاقانی کے علاوہ متعدد شعراء نے مراثی لکھے ہیں' جن میں ابوالحسن بیہقی کا ایک عربی قطعہ ابن خلکان چاپ تہران ۲ : ۰ہم نے درج کیا ہے۔ دیکھیے مقدمۂ دیوان خاقانی چاپ سجادی ص ۵۴۔

ہم ہیکر سلامت و ہم نقش عافیت
در دیدۂ نظارگیان در نقاب شد

عافیت اور سلامتی کے نقش و نگار دیکھنے والوں کی نظر سے پوشیدہ ہو گئے۔

عاقل کجا رود کہ جہاں دار ظلم گشت
نحل از کجا چرد کہ گیا زہر ناب شد

دنیا ظلم کا گھر بن چکی ہے' عقلمند کے لیے اب کوئی جگہ باقی نہیں (انسان تو انسان) شہد کی مکھی کے لیے رس چوسنے کے لیے پھل پھول زہر ناب ہو گئے ہیں' ان کے لیے اب کوئی چیز باقی نہیں۔

در ترکتاز فتنہ ز عکس خیال خون
کیوان بشکل ہندوی اطلس نقاب شد

فتنہ و فساد میں جو خون بہا ہے' اس کے خیال کا عکس کیوان پر پڑا تو وہ ایک ہندو کے مانند اطلس نقاب ہو گیا (یعنی اس نے سرخ رنگ کا نقاب پہن لیا۔)

افلاک را پلاس مصیبت بساط گشت
اجرام را وقایۂ ظلمت حجاب شد

مصیبت کے پلاس افلاک پر بساط کی طرح بچھ گئے اور ظلمت کے اجرام فلکی کے لیے حجاب بن گئے۔

ماتم سرای گشت سپہر چہار مین
روح الامین بہ تعزیت آفتاب شد

چوتھا آسمان ماتم سرا بن گیا اور روح الامین آفتاب کی تعزیت میں گئے۔

وز بہر آنکہ نامۂ بر تعزیت شود
شام و سحر دو پیک کبوتر شتاب شد

شام و سحر جو دو پیک کبوتر ہوئے تاکہ تعزیت کے پیغام کے نامہ بر بنیں۔

دیدم صف ملائکہ بر چرخ نوحہ گر

جتنا کہ صبح کے خطیب نے خطاب کیا،

چندانکہ آں خطیب سحر در خطاب شد

تو دیکھا کہ آسمان پر ملائکہ صف بہ صف نوحہ گر ہیں۔

گفتم بگوش صبح کہ این چشم زخم چیست
کاشکال و حال چرخ چنین ناصواب شد

میں نے صبح کے کان میں یہ بات کہی کہ یہ کس چشم بد کا نتیجہ ہے کہ آسمان کے حالات ایسے ناگفتہ بہ ہو گئے۔

صبح آہ آتشین ز جگر بر کشید و گفت
دردا کہ کارہای خراسان ز آب شد

صبح نے سوزناک آہ کھینچی اور کہا حیف صد حیف کہ خراسان کے کاروبار کی آب تاب جاتی رہی۔

گردوں سر محمد یحییٰ بہ باد داد
محنت رقیب سنجر مالک رقاب شد

آسمان نے امام محمد یحییٰ کو برباد کر ڈالا، اور مصیبت سلطان سنجر فرمانروا کے ساتھ چمٹ گئی۔

از حبس این خدیو خلیفہ دریغ خورد
در قتل آن امام پیمبر مصاب شد

سلطان سنجر کے حبس میں ڈالے جانے پر خلیفہ کو بڑا صدمہ ہوا اور امام محمد یحییٰ کی شہادت پر حضور اکرمؐ غمزدہ ہوئے۔

بدعت ز روی حادثہ پشت ہدی شکست
شیطان خلاف قاعدہ رجم شہاب شد

بدعت نے ایسا حادثہ ڈالا کہ ہدایت کی پشت ٹوٹ گئی اور شیطان جو شہاب ثاقب کے تیروں کا نشانہ تھا، وہ خود شہاب کا تیر ہو کر انسانوں کو اپنا نشانہ بنا رہا ہے۔

ای آفتاب خنجر زرین مکش کہ باز

اے سورج اپنی زریں شعاعوں کے (خنجر)

شمشیر سنجری ز قضا در قراب شد

کے ساتھ نہ نکل اس لیے کہ قضا و قدر نے سنجر کی شمشیر کو غلاف کے اندر بند کر رکھا ہے۔

ای مشتری ردا بنہ از سر کہ طیلسان
در گردن محمد یحییٰ طناب شد

اے مشتری تو سر سے چادر گرا دے اس لیے کہ امام محمد یحییٰ کی گردن میں انکی چادر پھانسی کا پھندا ہو گئی (امام کے منہ میں خاک ٹھونس کر ان کی چادر کا پھندا لگا اور بڑی اذیت ناک طریقے سے انکو غزوں نے مار ڈالا، لعنھم اللہ)

ای عندلیب گلبن دین زار نال زار
کز شاخ شرع طوطی حاضر جواب شد

اے دین کے گلشن کے بلبل زار زار نالہ کر اس لیے کہ شاخ شرع کا حاضر جواب طوطی باقی نہیں رہا۔

ای ذوالفقار دست ہدی زنگ گیر زنگ
کان بوتراب علم بزیر تراب شد

اے ہدایت کے ہاتھ کی ذوالفقار زنگ آلود ہو جا اس لیے کہ علم کا بوتراب مٹی میں دفن ہو چکا ہے۔

خاقانیا وفا مطلب از اہل عصر از آنک
در تنگنای دہر وفا تنگیاب شد

اے خاقانی اہل زمانہ سے وفا طلب نہ کر اسلیے کہ زمانے کے تنگنا میں وفا نایاب ہے۔

آن کعبۂ وفا کہ خراسانش نام بود
اکنوں بپای پیل حوادث خراب شد

خراسان جس کا نام تھا وہ وفا کا کعبہ تھا، اب حوادث کے پیل نے اسے کچل کر برباد کر دیا ہے۔

عزمت کہ زی جناب خراسان درست بود
برہم شکن کہ بوی امان زان جناب شد

(اے خاقانی) تیرا ارادہ خراسان جانے کا مصمم ہو چکا تھا، اب ارادہ ترک کر دے اس لیے کہ اب وہاں وفا کا نام و نشان نہیں۔

بر طاق نہ حدیث سفر زانکہ روزگار
چون طالع تو نامزد انقلاب شد

سفر کی بات چھوڑ اس لیے کہ جس طرح تیری قسمت نامزد انقلاب ہے، زمانہ بھی انقلاب پذیر ہے۔

در حبسگاہ شروان با درد دل بساز
کان درد راہ توشۂ یوم الحساب شد

شروان کے قید خانے میں درد دل و سوز جگر کے ساتھ سازگاری پیدا کر، یہی درد و سوز سفر آخرت کے لیے توشۂ راہ کا کام دے گا۔

امام محمد یحییٰ کے ایک مرثیے میں "خاک" ردیف اس نسبت سے قرار دیا ہے کہ ملعون غزوں نے اس امام عالی مقام کے منہ میں مٹی ٹھونس کر شہید کیا تھا، اس منظومہ کے چند شعر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

ناورد محنت است درین تنگنای خاک
محنت برای مردم و مردم برای خاک

خاک کی اس تنگ جگہ میں محنت ہی محنت ہے آدمیوں کے لیے محنت و مصیبت اور آدمی خاک کے لیے ہے۔

جز حادثات حاصل این تنگنای چیست
ای تنگ حوصلہ چہ کنی تنگنای خاک

اس تنگنائے دنیا کا حاصل حادثات کے علاوہ کچھ نہیں، اے پست حوصلہ اس خاکی تنگنای کے کھودنے سے کیا فائدہ۔

این عالمی است جافی و زجیفہ موج زن
صحرای جان طلب کہ عفن شد ہوای خاک

دنیا جفا جو ہے اور بدبودار لاشوں سے بھری پڑی ہے، جان کا لق و دق میدان ڈھونڈھ لیجیے کہ زمین کی ہوا متعفن ہو چکی ہے۔

خواہی کہ جان بہ شط سعادت برون بری

اگر تیری آرزو ہے کہ سعادت کے دریا تک

بگریز ازین جزیرہ وحشت فزای خاک

پہنچے تو دنیا (زمین) کے وحشت افزا جزیرہ سے بھاگ۔

خواہی کہ در خورنگہ دولت کنی طواف
برخیز ازین خرابۂ نادلگشای خاک

اگر تو چاہتا ہے کہ دولت کے محل سرا میں طواف کرے تو خاک کے اس ناپسندیدہ اجاڑ جگہ سے اٹھ جا۔

دوران آفت است چہ جوئی سواد دہر
ایام صرصر است چہ سازی سرائے خاک

زمانہ آفت ہی آفت ہے، اس میں دہر کی سرسبزی کی تلاش بے سود ہے، ایام تیز آندھی کے مشابہ ہیں، یہاں مٹی کے مکان کیوں بنا رہا ہے۔

ہرگز دو خانہ عالم خاکی نیافت کس
حق بود دیو را کہ نشد آشنای خاک

عالم خاکی سے کسی کو وفا نہیں ملی، اچھا ہوا کہ شیطان خاک سے بے تعلق رہا۔

خود را بدست عشوۂ ایام دا آمدہ
کز باد کس امید ندارد وفای خاک

زمانے کے فریب میں اپنے کو مبتلا نہ کر، کہیں باد و فای خاک کی امید کی جا سکتی ہے۔

خاقانیا جنیبت جان را عدم فرست
کان چرب آخورش بہ ازین سبز جای خاک

اے خاقانی تو اپنی جان کے گھوڑے کو عدم میں بھیج دے، وہاں کا چکنا اصطبل زمین کی سبز چراگاہ سے بہتر ہے۔

نیلی بہر بہا بخرہ و در دو دیدہ کش
باری نہ بینی این گہر بی بہای خاک

سلائی جس قیمت میں ملے اسے خرید لو اور دونوں آنکھوں میں سرمہ لگاؤ، مٹی کا یہ بیش قیمت گہر کہیں اور ملے گا نہیں۔

خاصہ گر بر دریغ خراسان سیاہ گشت
خورشید زیر سایۂ ظلمت فزای خاک

خراسان کی مصیبت کی بنا پر خورشید خاص طور پر زمین کے تاریک سایہ کے نیچے سیاہ ہو گیا۔

گفتی پی محمد یحییٰ بماتم اند
از قبۂ ثوابت تا منتہای خاک

گویا کہ ستاروں کی بلندی سے خاک کے انتہائی نیچے حصے تک سب کے سب امام محمد بن یحییٰ کے ماتم میں ہیں۔

او کوہ علم بود کہ برخاست از جہاں
بی کوہ کی قرار پذیرد بنای خاک

وہ علم کے پہاڑ تھے جو دنیا سے اٹھ گئے، بغیر پہاڑ کے بنای خاک کو قرار نہیں۔

تب لرزہ یافت پیکر خاک از فراق او
ہم مرقد مقدس او شد شفای خاک

پیکر زمین ان کے فراق میں تب لرزہ میں مبتلا ہے، ان کا مرقد مقدس خاکِ شفا فراہم کرتا ہے۔

بردست خاکیان خپہ گشت آن فرشتہ خلق
ای کائنات واحزنا از جفای خاک

دنیا والوں نے اس فرشتہ خصلت امام کا گلا گھونٹ دیا، اے کائنات دنیا کے ظلم پر افسوس صد افسوس ہے۔

دید آسمان کہ در دہنش خاک می کنند
وآنگاہ دید کہ نیست دہانش سزای خاک

آسمان نے دیکھا کہ ان کے منھ میں خاک ٹھونسی جا رہی ہے حالانکہ وہ جانتا تھا کہ ان کا منھ خاک ٹھونسے جانے کے لائق نہیں۔

ای خاک بر سر فلک آخر چرا نگفت
کاین چشمۂ حیات سزا نیست جای خاک

اے خاک آسمان نے آخر کس لئے کیوں نہیں کہا کہ اس چشمۂ حیات کی جگہ خاک کو نہ بناؤ (یعنی ایسا شخص زمین میں دفن ہونے کے لائق

بلکہ اس سے بالاتر مقام کا حامل ہے۔

در ملت محمد مرسل نداشت کس
فاضل تر از محمد یحییٰ قبای[عہ] خاک

اسلام میں محمد یحییٰ سے بڑا کوئی فاضل نہیں گزرا جس نے مٹی کی قبا پہنی ہو۔

آن[1] کرد روز تہلکہ دندان فدای سنگ
واین کرد گاہ فتنہ دہان را فدای خاک

حضور اکرمؐ کا جنگ میں دندان مبارک شہید ہوا اور امام محمد یحییٰ کا فتنۂ غز میں منہ خاک پر فدا ہوا، یعنی منہ میں اتنی خاک ٹھونسی گئی کہ اس کی وجہ سے امام نے جان دیدی۔

عہ در دیوان خاقانی ص ۴۷۶ (مقدمہ) و ص متن: قبای خاک، اور یہ غلط ہے، راحۃ الصدور ۱۸۱ قبای خاک صحیح ہے۔ [1] ان قصائد کے علاوہ دو قطعات میں خاقانی نے امام محمد یحییٰ کی شہادت پر اپنے رنج و غم کا اظہار کیا ہے، وہ قطعے اس طرح پر ہیں:

خاقانیان بسوگ خراسان سیاہ پوش　　کایام فتنہ گرد سوادش سیاہ برد
عیسیٰ بحکم رنگرزی بر مصیبتش　　نزدیک آفتاب لباس سیاہ برد
دھر از سر محمد یحییٰ ردا فگند　　گردون ز فرق دولت سنجر کلاہ برد
ہامی خاقانی ترا جای شکر پیداست شکو　　گر دہانت را بآب زہرناک آگندہ اند
محی الدین کو دہان دین بہ دُر آگندہ بود　　کافران خود دہانش را بخاک آگندہ اند

راحۃ الصدور راوندی ص ۱۸۱-۱۸۲ نے غزوں کے قتل و غارت کے بیان میں خاقانی کے اشعار نقل کیے ہیں۔ یہاں اس کا بیان مختصر درج کیا جاتا ہے:

غزان مرو را کہ دار الملک بود سہ روز متواتر می غارتیدند و اغلب مردم شہر را اسیر کردند و بعد از غارتہا عذاب می کردند و بر وی زمین و زیر زمین ہیچ نگذاشتند پس روی بہ نیشاپور

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۶ پر)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۵) نہادند مردم نیشاپور اول کوششی بکردند و قومی را از ایشان در شہر
کشتند چون ایشان را خبر شد حشر آوردند و اغلب خلق زن و مرد و اطفال در مسجد جامع
منیعی گریختند، غزان تیغ در نہادند و چندان خلق را در مسجد کشتند کہ کشتگان در میان
خون ناپیدا شدند ۔ آتش در آن مسجد زدند و شعلہا چندان ارتفاع گرفت کہ جملہ شہر
روشن شد تا روز در آن روشنی غارت می کردند و اسیر می بردند ۔ و اسیران را شکنجہ می
کردند و خاک در دہان می آگندند تا اگر چیزی دفین کردہ بودند می نمودند .. و در شمار نیاید کہ درین
چند روز چند ہزار آدمی بقتل آمد و جای کہ شیخ محمد اکاف کہ مقتدا و پیشوای مشائخ عالم و خلف
سلف صالحین بود و مثل محمد یحییٰ کہ سرور ائمۂ عراق و خراسان بود و پیشوای علماء ایشان را
بشکنجہ بکشتند و بد بانی کہ چندین سال مطلع علوم شرعی و منبع احکام دین بودہ باشد چنین
کنند بر کسی دیگر چہ ابقا رود و خاقانی در مرثیہ می گوید، قصیدہ :

در دولت محمد مرسل نداشت کس — فاضل تر از محمد یحییٰ قبای خاک
آن کرد در روز تہلکہ الخ

خاقانیا بہ سوگ خراسان سیاہ پوش — کایام فتنہ گرد سوادش سیاہ برد الخ

وچون غزان برفتند مردم شہر را بسبب اختلاف مذاہب حقاید قدیم بود ہر شب فرقتی
از محلتی حشر می کردند و آتش در محلت مخالفان می زدند تا خرابہا کہ از آثار غز ماندہ بود اطلال
شد و قحط و وبا بدیشان پیوست تا ہر کہ از تیغ و شکنجہ جستہ بود بنیاز بمرد (ص ۱۸۰-۱۸۲) (باقی)

شعر العجم

علامہ شبلیؒ کی مشہور کتاب جس میں فارسی شاعری کی تاریخ کے ساتھ اس کے شعراء کا عہد بہ عہد
تذکرہ کیا گیا ہے اور اصناف شعر پر مفصل تبصرہ بھی ہے ۔
قیمت جلد اول ۴۰؍ روپیے دوم ۳۵؍ روپیے سوم ۲۵؍ روپیے چہارم ۳۵؍ روپے پنجم ۲۵؍ روپے ۔

سر سید احمد خاں اور انکی تفسیر القرآن

از
محمد عارف اعظمی عمری، رفیق دار المصنفین

سر سید احمد خاں مرحوم کی ذات محتاج تعارف نہیں ہے، ان کا سب سے اہم اور
نہایت قابل فخر کارنامہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی تاسیس ہے، جو اب مسلم یونیورسٹی کے
نام سے پوری دنیا میں مشہور و معروف ہے، ان کا دوسرا کارنامہ قدیم تاریخی کتابوں کی
اشاعت اور مذہبی کتب و رسائل کی تصنیف ہے جو خاص اہمیت کی حامل ہیں، ان کی
تصانیف میں سب سے زیادہ متنازعہ انکی کتاب تفسیر القرآن ہے، یہ ان کی آخری نامکمل
تصنیف ہے، اصلاً اس مضمون میں اسی پر بحث و تبصرہ مقصود ہے مگر مناسب معلوم
ہوتا ہے کہ پہلے ان کے حالات و سوانح کا اجمالی خاکہ پیش کر دیا جائے ۔

مختصر حالات و سوانح

سر سید احمد خاں ۵ ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ / ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو
دہلی میں پیدا ہوئے، انکا خاندان مغل فرمانروا شاہجہاں کے عہد حکومت میں ہرات
سے ہندوستان آیا اور سلطنت کے اہم عہدوں پر فائز ہوا، سر سید کے خاندان کے
لوگوں کا تعلق سلطنتِ مغلیہ سے اس کے آخری دور تک قائم رہا، ان کے والد شیخ
متقی بھی جو مرزا مظہر جان جاناںؒ کے خلیفہ شاہ غلام علیؒ سے بیعت تھے، دربار سے
وابستہ تھے اور ان کو وہاں سے باقاعدہ وظیفہ ملتا تھا ۔

سرسید کی والدہ نے ان کی پرورش کی، وہ بڑی منتظم اور نہ ہی صلاحیت خاتون تھیں، سرسید کو تعلیم کی تکمیل کا موقع نہیں ملا۔ ایک عرصہ کے بعد جب وہ ملازمت کے سلسلہ میں دہلی آئے تو انھوں نے مولوی نوازش علی مرحوم سے فقہ اصول فقہ کی کچھ کتابیں پڑھیں از مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے ادب کی کچھ تعلیم حاصل کی اور مولانا مخصوص اللہ سے جو شاہ عبدالعزیزؒ کے بھتیجے تھے، علم حدیث میں مشکوٰۃ اور ایک خاص حصہ جامع ترمذی کا اور کسی قدر اجزا صحیح مسلم کے پڑھے اور پھر قرآن مجید کی سند لی۔[1]

۱۸۳۸ء میں والد کے انتقال کے بعد سرسید نے ملازمت کے لیے تگ و دو شروع کی، چنانچہ بائیس ۲۲ برس کی عمر میں اپنے خالو خلیل اللہ خاں صدر امین دہلی کے پاس عدالت کا کام سیکھ کر سررشتہ دار ہو گئے، اس کے بعد آگرہ کے کمشنر کے دفتر میں نائب منشی مقرر ہوئے، پھر منصفی کا امتحان پاس کر کے دسمبر ۱۸۴۱ء میں مین پوری کے منصف ہو گئے اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے جج کے عہدے پر فائز ہوئے اور اس حیثیت سے انہیں فتح پور سیکری کا دہلی، رہتک، بجنور، مرادآباد، غازیپور اور بنارس میں قیام کرنے کا موقع ملا، بالآخر ۱۸۷۶ء میں انھوں نے پنشن لی اور مدرسۃ العلوم کے کاموں میں لگ گئے۔

ملازمت کے زمانہ ہی ۱۸۶۹ء میں انھوں نے انگلستان کا سفر کیا، جو انکی زندگی میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے، اسی سفر میں انھوں نے ولیم میور کے جواب میں اپنی مشہور کتاب خطبات احمدیہ لکھی۔

۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی داغ بیل ڈالی، جس کے بعد وہ اسی کی

[1] مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی 'مقالات شیروانی' علی گڑھ ۱۹۴۷ء صفحہ ۵۳۔

تعمیر و ترقی کے لیے وقف ہو گئے اور علی گڑھ میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔

۵ ذی القعدہ ۱۳۱۵ھ/ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو علی گڑھ میں وفات پائی اور دوسرے روز مدرسۃ العلوم کی مسجد کے احاطہ میں تدفین ہوئی۔[1]

تصنیفات سرسید کا علمی ذوق بہت اچھا تھا اور ان میں تصنیف و تالیف کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی، ملازمت اور مدرسۃ العلوم کی گوناگوں مشغولیتوں کے باوجود انھوں نے متعدد اہم علمی کتابیں لکھیں، مولانا حالی نے ان کی تصانیف کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے؛ ۱۔ مذہبی ۲۔ تاریخی ۳۔ علمی۔[2]

ان کی تصنیفات کی بنیاد پر مستشرق بلجون نے ان کے مذہبی خیالات کے تین ۳ دور قائم کیے ہیں؛ ۱۔ ۱۸۴۳ء تا ۱۸۵۷ء ۲۔ ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۹ء (سال سفر انگلستان) اور ۳۔ ۱۸۷۰ء تا ۱۸۹۸ء، بلجون کے بیان کے مطابق ان کی مذہبی روشن خیالی کا اصل سبب انکا سفر انگلستان تھا۔[3] ڈاکٹر سید عبد اللہ بھی بلجون کی اس رائے سے متفق ہیں، ان کے خیال میں سرسید کے پہلے دور کی تصنیفات پر گو نئے اثرات بھی مترتب ہوئے تاہم ان میں قدیم رنگ ہی زیادہ نمایاں ہے، دوسرے دور میں انھوں نے غدر سے پیدا شدہ حالات کے نتیجہ میں کتابیں اور رسالے لکھے، البتہ ان کا دور سوم بہت نتیجہ خیز ہے۔[4] انکی بعض اہم کتابوں کے نام یہ ہیں۔

[1] سرسید احمد خاں کی مفصل سوانح عمری کیلئے ملاحظہ فرمائیں؛ مولانا الطاف حسین حالی؛ حیات جاوید [2] ایضاً ضمیمہ ۲

[3] ڈاکٹر سید معین الحق، سرسید کے علمی و ادبی کارنامے "برگ گل سرسید نمبر ۱۹۶۷-۱۹۶۸ء" ص ۱۳۹ حاشیہ

[4] ڈاکٹر سید عبد اللہ، احمد خاں؛ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد دوم، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۶۶ء، ص ۸۷ - ۱۱۲۔

۱۔ آثار الصنادید، مطبوعہ ۱۸۴۷ء ۲۔ تاریخ سرکشی ضلع بجنور، مطبوعہ ۱۸۵۸ء
۳۔ اسباب بغاوت ہند، مطبوعہ ۱۸۵۸ء ۴۔ تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام، مطبوعہ ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء ۵۔ رسالہ طعام اہل کتاب، مطبوعہ ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء ۶۔ خطبات احمدیہ، مطبوعہ ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء۔[1]

تفسیر القرآن تفسیر القرآن کے متفرق اجزاء ابتداء میں رسالہ تہذیب الاخلاق میں طبع ہوتے رہے، پھر جب وہ علی گڑھ میں مستقل قیام پذیر ہوئے تو اس کام کا باقاعدہ آغاز کیا، اس کی پہلی جلد ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء میں طبع ہوئی، اس کے بعد وقتاً فوقتاً اس کی جلدیں شایع ہوتی رہیں، سرسید کی زندگی میں سورۂ بنی اسرائیل کے اختتام تک اس کی چھ[6] جلدیں شایع ہو چکی تھیں، ان کی وفات کے بعد اس کی ساتویں جلد جو سورۂ کہف تا سورۂ طٰہٰ کی تفسیر پر مشتمل ہے چھپی، یہ تمام جلدیں مطبع مفید عام آگرہ سے طبع ہوئیں۔

اہم خصوصیات مولانا حالی مرحوم نے تفسیر القرآن کی مندرجۂ ذیل پانچ[5] خصوصیات بتائی ہیں۔

۱۔ اخبار ماضیہ کی تنقیح ۲۔ احکام اسلام پر اعتراضات کا جواب ۳۔ موضوع وضعیف احادیث سے اجتناب ۴۔ تعدد اقوال اور مفسرین کی متضاد آراء کے بجائے محض مرجح قول کے ذکر پر اکتفاء ۵۔ علوم جدیدہ کی وجہ سے پیدا ہونے والے شبہات کا ازالہ اور جدید علم کلام کی تاسیس[2]

مولانا حالی مرحوم نے بجا طور پر آخری خصوصیت کو خاص اہمیت کا حامل بتایا ہے،

---

[1] مولانا حالی، حوالہ سابق [2] ایضاً .... جلد دوم، ص ۱۹۱ تا ۲۱۴۔

ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط کے بعد یہ موضوع نہایت اہم ہو گیا تھا اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ سرسید نے اپنی بساط کے مطابق اپنے دور کے اس اہم اور ضروری کام کو انجام دینے کی کوشش بھی کی مگر چونکہ وہ باقاعدہ اور مستند عالم نہیں تھے اسلیے ان سے تفسیر میں غلطیاں بھی ہوئیں اور وہ دور از کار تاویلات میں بھی جا پڑے۔

اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ سرسید نے علماء کے طبقہ میں ایک ہلچل پیدا کر دی تھی اور اپنی تحریروں کے ذریعہ انھوں نے ان کے جمود و تعطل کو توڑنے کی سعی بھی کی، مگر اس کا رد عمل بہت سخت ہوا اور جس شخص کے جو جی میں آیا کہنا شروع کیا، تاہم اسی اثنا میں اہل علم کی ایک معتدل اور درمیانی جماعت بھی پیدا ہوئی جس نے عقل و نقل کے درمیان تطبیق و ہم آہنگی پر زور دیا، یہی نقطۂ نظر مناسب اور موزوں بھی تھا، چنانچہ سنجیدہ علمی حلقوں میں اس کو قبولیت نصیب ہوئی، اس متوازن طرز فکر کی ایجاد کا سہرا علامہ شبلی نعمانیؒ کے سر بندھتا ہے، انھوں نے خود اور ان کے تلامذہ نے ان کی اس تحریک کو پروان چڑھایا۔

نظریۂ عقل و فطرت تفسیر القرآن کا مرکزی محور نظریۂ عقل و فطرت کے گرد گردش کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، اسی نظریہ سے سرسید نے قرآن مجید کے احکام کی تشریح و توجیہ کی ہے اور اس کی تعلیمات و ہدایات کو عقل و فطرت سے ہم آہنگ کرنے کی سعی کی ہے، اسلامی تاریخ میں تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں فلسفۂ یونان کے زیر اثر معتزلہ نے بھی یہی انداز فکر اختیار کیا تھا، چنانچہ سرسید کو معتزلہ کے طریقۂ تعبیر سے خاص مناسبت ہے، وہ ان کی تعریف میں لکھتے ہیں:

"تمام مفسرین کی سوائے معتزلہ کے یہ عادت ہے کہ اپنی تفسیروں میں محض بے سند

اور افواہی روایتوں کو جا تحقیق لکھتے چلے جاتے ہیں اور ذرا بھی تحقیق کی طرف متوجہ نہیں ہوتے ہیں[1]

دراصل سرسید کا نظریۂ عقل و فطرت ہو یا معتزلہ کا انداز فکر و تحقیق دونوں کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے دور کی تحقیقات اور ان کے نتائج کو قطعی مان کر مذہب کو اس سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ مذہب کی باتوں کو قطعی و یقینی تسلیم کر کے ان کی روشنی میں حکماء و فلاسفہ کے اقوال و نتائج کا تجزیہ کرنا چاہیے تھا، جو صحیح طریقہ کار تھا اور جس پر معتزلہ کے مقابلے میں اس عہد کے علمائے اہلِ سنت گامزن تھے البتہ اس معاملہ میں اشاعرہ کے غلو سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

تفسیر القرآن کے بعض اقتباسات سرسید کے نظریۂ عقل و فطرت کے مطابق خرق عادت کا ظہور غیر ممکن اور قانون قدرت کے منافی ہے، اس لیے انھوں نے قرآن مجید میں مذکور انبیائے سابقین کے معجزات کی بھی تاویلیں کی ہیں، مولانا حالی نے انھی تاویلات کو اخبار ماضیہ کی تنقیح کا نام دیا ہے اور اس کو تفسیر القرآن کی اہم خصوصیتوں میں شمار کیا ہے۔

سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل کے واقعات بالتفصیل بیان ہوئے ہیں جن میں متعدد خرق عادت واقعات کا ذکر ہوا ہے، ان میں سے بعض واقعات کے سلسلہ میں سرسید کی تاویلات پیش کی جاتی ہیں۔

قرآن مجید میں تاریخ بنی اسرائیل کے ایک اہم واقعہ عبور بحر کا ذکر ہے جو ان پر اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات کے ضمن میں کیا گیا ہے، اس کے متعلق سرسید مرحوم لکھتے ہیں:

"پس صاف معنی یہ ہیں کہ خدا نے حضرت موسیٰ کو کہا کہ اپنی لاٹھی کے سہارے سے

---

[1] سرسید احمد خاں، تفسیر القرآن ج ۱، ص ۲۱۔

سمندر میں چل وہ پھٹا ہوا یا کھلا ہوا ہے یعنی پایاب ہو رہا ہے، سورۂ طٰہٰ میں جو آیت ہے اس میں صاف بیان ہوا ہے کہ میرے بندوں کو رات کو سمندر میں سوکھے رستے سے لے کر نکل چل، پس جو معجزہ تھا وہ یہی تھا کہ ایسے مشکل وقت میں سمندر کے پایاب ہونے سے خدا تعالیٰ نے موسیٰ کو اور تمام بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجے سے بچا دیا اور جب فرعون نے پایاب اترنا چاہا تو پانی بڑھ گیا وہ مع اپنے لشکر کے ڈوب گیا"[1]

انھوں نے مذکورہ بالا توجیہ کی تائید میں دلائل پیش کرنے کے بجائے علمائے اسلام کی علمی بے بضاعتی پر اشک ریزی کی ہے، لکھتے ہیں:

"علمائے اسلام کا زمانہ گیارہ بارہ سو برس سے سمجھنا چاہیے، ان بزرگوں نے اپنے ہوش سے بحر احمر اور اس کی شاخ کو جس میں سے حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل نے عبور کیا تھا نہایت عمیق اور ایک تھار سمندر دیکھا ہے اور ان کے خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ کیسا ہی بڑا جوار بھاٹا آئے وہ جگہ کبھی پایاب نہیں ہو سکتی اس لیے انھوں نے قرآن مجید کی صاف صاف عبارت اور الفاظ کو جو صریح جوار بھاٹے اور خشک زمین کے نکل آنے پر دلالت کرتی تھی الٹ پلٹ کر اس واقعہ کو بطور ایک عجیب واقعہ کے بنایا اور ایسا معجزہ جو قانون قدرت کو بھی توڑ دے ٹھہرایا، مگر حقیقت حال یہ نہیں ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جب بنی اسرائیل نے عبور کیا بحر احمر ایسا تھار سمندر نہ تھا جیسا کہ اب ہے"[2]

بنی اسرائیل کے سروں پر اللہ تعالیٰ نے کوہ طور کو بلند کر کے ان سے عہد و پیمان لیا تھا جس کا ذکر قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں ہے، سرسید اس واقعہ کی توجیہ یوں

---

[1] سرسید احمد خاں، حوالہ سابق، ج ۱، ص ۸۶ تا ۹۔ [2] ایضاً ص ۱۰۰۔

کرتے ہیں:

"بنی اسرائیل جو خدا کے دیکھنے کو گئے تھے طور یا طور سینین کے نیچے کھڑے تھے پہاڑ ان کے سر پر نہایت اونچا اٹھا ہوا تھا وہ اس کے سایہ تلے تھے اور طور بہ سبب آتش فشانی کے شدید حرکت و زلزلہ میں تھا جس کے سبب وہ گمان کرتے تھے کہ ان کے اوپر گر پڑے گا، پس اس حالت کو خدائے تعالیٰ نے ان لفظوں میں یاد دلایا ہے ورفعنا فوقکم الطور، واذ نتقنا الجبل فوقهم كانه ظلة وظنوا انه واقع بهم، پس ان الفاظ میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو عجیب ہو یا مطابق واقع اور موافق قانون قدرت نہ ہو، ہاں مفسرین نے اپنی تفسیروں میں اس واقعہ کو عجیب و غریب واقعہ بنا دیا ہے"[1]

قرآن مجید میں مذکور انبیائے سابقین کے معجزات کے بارہ میں تقریباً ہر جگہ یہی طرز فکر سرسید نے اختیار کیا ہے، جنکو طوالت کے خوف سے قلم انداز کیا جاتا ہے۔

علامہ شبلی اور انکے مکتب فکر کا موقف

علمائے اسلام نے سرسید کے نظریۂ اسباب و علل کی تردید میں بہت کچھ لکھا ہے، لیکن انھوں نے علت و معلول کی بحث کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے، افراط و تفریط پر مبنی ان نظریات کے درمیان ایک تیسرا نظریہ بھی ہے جس کے حاملین نے زیر بحث مسئلہ کے دونوں پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر ایک معتدل و متوازن موقف اختیار کیا، جس سے قدیم و جدید دونوں ذہن کے شکوک رفع ہوئے، اس کی وضاحت کے لیے علامہ شبلیؒ کی مندرجۂ ذیل تحریر ملاحظہ ہو:

"خرق عادت تمام مذاہب کا ایک ضروری عنصر ہے اور اس سے انکار نہیں ہوسکتا

[1] سید احمد خاں: حوالہ سابق، ج ۱، ص ۱۱۶۔

کہ اسلام میں بھی کچھ نہ کچھ اسکی جھلک موجود ہے، اس لیے اس عقدہ کا حل کرنا ضروری ہے۔ قرآن مجید میں اس قسم کے واقعات منقول ہیں، فرقۂ جدیدہ ان کی عموماً تاویل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ قرآن مجید میں اس قسم کا ایک واقعہ بھی مذکور نہیں، لیکن انصاف یہ ہے کہ قرآن مجید بلکہ تمام آسمانی کتابوں میں اس قسم کے واقعات کے مذکور ہونے سے انکار نہیں ہوسکتا، بے شبہ اشاعرہ کی افراط بچوں کی وہم پرستی کے درجہ تک پہنچ گئی ہے، لیکن انکار محض کرنا بھی کچھ کم ہٹ دھرمی نہیں ہے، ہمارے زمانہ کے لوگوں نے جو تاویلیں کی ہیں ہم اس سے بخوبی واقف ہیں، بے شبہ یہ تاویلیں نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے کافی ہیں، جو بے چارے عربی زبان اور اس کے طرز و اسلوب سے نا آشنا ہیں، مگر ماہر عربیت کے سامنے یہ تلمیع کیا کام دے سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جدید فرقہ چونکہ وہم پرست مسلمانوں کا طرف مقابل ہے اس لیے ضرور تھا کہ وہ اعتدال سے متجاوز ہو جائے، ایک طرف جب یہ افراط ہے کہ ہر قسم کے ناممکن اور محال واقعات ہر کس و ناکس سے سرزد ہو سکتے ہیں اور کرامۃ الاولیاء حق کے دائرہ کی وسعت کی کوئی حد نہیں قرار پائی تو اس کے مقابلہ میں یہ تفریط کوئی تعجب انگیز نہیں کہ کوئی واقعہ جو بظاہر خلاف ہو ہرگز وقوع میں نہیں آسکتا، لیکن ہم کو افراط و تفریط سے الگ ہو کر خود حقیقت حال پر غور کرنا چاہیے"[1]

اس کی مزید تشریح کے لیے جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی کا مندرجۂ ذیل اقتباس بھی پیش نظر رکھا جائے جس میں انھوں نے مسئلہ اسباب و علل کی تشریح کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

[1] علامہ شبلی: الکلام، ص ۱۱۵-۱۱۶۔

"مسئلہ اسباب وعلل نے دوسرے مذاہب کی طرح اسلام میں بھی دو فرقے پیدا کر دیے ہیں ایک فرقہ وہ ہے جو دنیا میں صرف اسباب وعلل کے اختیارات کو تسلیم کرتا ہے اور ان اختیارات کو ناقابل نسخ و تغیر مانتا ہے، اس کے نزدیک اس عالم میں جو کچھ ہوتا ہے وہ انہی مادی علل و اسباب کے ماتحت ہوتا ہے اور ان میں کسی قسم کا رد و بدل اور نسخ و تغیر نہیں ہوتا اور اس لیے وہ خرق عادت کو ممتنع اور محال یقین کرتا ہے۔ کیونکہ یہ اسباب وعلل اور عالم کا یہ نظام کا دستۃ الٰہی ہے اور سنن الٰہی میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا ..... دوسرا فریق اللہ تعالیٰ کو نظام خاص قوانین فطرت اور اسباب وعلل کا پابند ٹھہرانا اس کی شان قدرت کے منافی سمجھتا ہے اور وہ ان بیچ کے وسائط کے بغیر اس کو فرمانروائے مطلق یقین کرتا ہے .....

حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں فریق افراط و تفریط کے دو کناروں پر ہیں.... قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ اشیاء اسباب وعلل سے پیدا ہوتی ہیں اور ان میں طبائع و خواص ہیں لیکن یہ اسباب وعلل اور طبائع و خواص خود خلاقِ عالم کے پیدا کردہ اور مقرر کردہ ہیں اور وہ ان ہی پر عموماً کاربند رہتا ہے، لیکن وہ اس درجہ ان کا مجبور اور پابند نہیں کہ وہ ان میں تغیر نہ کر سکتا ہو اور کبھی اپنے خاص حکم و ارادہ سے بھی وہ ان کو شکست نہ کر سکتا ہو، کیونکہ اس عقیدہ سے کفر پرورش پاتا ہے اور خدا کی قدرت و عظمت میں فرق آجاتا ہے، اسی لیے ہر موقع پر قرآن مجید نے اپنی تعلیم میں اس نقطہ کو ملحوظ رکھا ہے کہ اسباب وعلل کے ساتھ خدا کی مشیئت اور ارادہ کو پیش نظر رکھا ہے، تاکہ انسانوں میں خدا کی مجبوری، معذوری اور عدم قدرت کا تصور نہ پیدا ہو... معجزہ کا سبب اور علت براہ راست اس کی

مشیئت اور ارادہ ہے، کبھی یہ مشیئت اور ارادہ عادات جاریہ اور ظاہری علل واسباب کے پردہ میں ظاہر ہوتا ہے مثلاً قوم نوحؑ کے لیے طوفان کا آنا، قوم ہودؑ کے لیے کوہ آتش فشاں کا پھوٹنا یا زلزلہ آنا، حضرت ایوبؑ کا چشمہ کے پانی سے صحت و تندرست ہو جانا، قوم صالحؑ کے لیے آندھی آنا، مکہ میں قحط عظیم کا رونما ہو جانا، غزوۂ خندق میں آندھی چلنا، یہ تمام نشانیاں ظاہری اسباب اور عادات جاریہ کے خلاف نہیں، لیکن ان اسباب کے ظاہر ہونے کا سبب جس میں حق کی فتح اور باطل کی شکست نیکوکاروں کی نجات اور گنہگاروں کی ہلاکت ہوئی محض بخت و اتفاق نہیں بلکہ ارادہ و مشیئت الٰہی نے خاص ان قوموں کے لیے بطور نشانی کے ان کو پیدا کیا اور کبھی یہ مشیئت الٰہی عادات جاریہ اور اسباب ظاہری کا نقاب اوڑھ کر نہیں بلکہ بے پردہ نشان بن کر سامنے آتی ہے، مثلاً عصا کا سانپ بن جانا، انگلیوں سے چشمہ کا جاری ہونا، مردہ کا جی اٹھنا، چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا، پتھر سے چشمہ کا ابلنا، درختوں کا اپنی جگہ سے حرکت کرنا، بے جان چیزوں میں آواز پیدا ہونا کہ ان چیزوں کی تشریح موجودہ علم اسباب وعلل کی بنا پر نہیں کی جا سکتی اور نہ ان کو عادات جاریہ کے مطابق کہا جا سکتا ہے۔"[1]

سرسید سے قبل حکمائے اسلام میں فارابی اور ابن سینا کا بھی یہ خیال تھا کہ معجزہ اسباب خفیہ کی بنا پر صادر ہوتا ہے، اور وہ طبعی اسباب وعلل سے معرا نہیں ہوتا، اس لیے اس پر خرق عادت کا اطلاق درست نہیں ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ان کے اس خیال کی کمزوری بھی ثابت کی ہے، جس سے سرسید کے نظریہ عقل و فطرت کی بے حقیقتی عیاں ہو جاتی ہے۔ سید صاحبؒ لکھتے ہیں:

---

[1] مولانا سید سلیمان ندویؒ، سیرۃ النبیؐ، ج ۳، ص ۲۶۷ تا ۲۸۵۔

"حکمائے اسلام فارابی اور ابن سینا وغیرہ کہتے ہیں کہ معجزہ اسباب خفیہ کی بناء پر صادر ہوتا ہے ..... حضرت موسیٰؑ مصر سے بنی اسرائیل کو لے کر چلے تو راستہ میں بحر قلزم (بحیرۂ احمر) حائل تھا، حکم ہوا کہ اپنی لکڑی سے دریا کو مارو دفعتہً دریا خشک ہوگیا اور راستہ پیدا ہوگیا، حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو لے کر اتر گئے، لیکن جب فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ دریا میں قدم رکھا تو دریا پھر اپنی اصلی حالت پر آگیا اور وہ اپنے لشکر کے ساتھ ڈوب کر مرگیا، وہ اس کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ دریا میں مدوجزر تھا، جب حضرت موسیٰؑ پہونچے تو جزر تھا اور جب فرعون آیا تو مد ہوگیا اور جس وقت فرعون دریا میں داخل ہوا مد شروع ہوگیا اور وہ ڈوب گیا، ہم ان اعتراضات کو جو نقلی حیثیت سے اس توجیہ پر وارد ہوتے ہیں کہ توراۃ اور قرآن مجید نے اس معجزہ کی جس طرح تشریح کی ہے اس کی یہ صحیح نقل نہیں ہے نظر انداز کرتے ہیں، سوال یہ ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰ پہونچے تو جزر تھا اور جب فرعون آیا تو مد ہوگیا، آیا یہ اتفاقی امر تھا اور ممکن تھا کہ اس کے برعکس ہوتا یعنی فرعون بچ جاتا اور حضرت موسیٰؑ ڈوب جاتے اور یا یہ کہ حضرت موسیٰؑ کے لیے جزر اور فرعون کے لیے مد خاص طور سے پیدا کیا گیا تھا یا ایسے اسباب بہم پہنچائے گئے کہ حضرت موسیٰؑ جزر کے وقت پہونچیں اور فرعون مد کے وقت پہونچے اور اس کے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ وہ اس خطرناک دریا میں بے سمجھے بوجھے قدم رکھے، پہلی صورت میں تو معجزہ کیا نبوت کی بھی تشکیک لازم آتی ہے اور دوسری صورت میں خرق عادت کی تسلیم سے چارہ نہیں اور خرق عادت کے تسلیم کر لینے کے بعد خدا کی قدرت مطلقہ پر بھی ایمان لانا ہوگا۔"[1]

[1] مولانا سید سلیمان ندوی، حوالہ سابق، ص ۵۲۔

مستشرقین سے مرعوبیت | سرسید کے طریقہ تفسیر کی دوسری بڑی کمزوری مستشرقین سے ان کی مرعوبیت ہے، ان کی نگاہوں کے سامنے سلطنت مغلیہ کے کھنڈر پر برطانوی سامراج قائم ہوا تھا اس لیے وہ مسلمانوں کو ابتلاء و آزمائش سے بچانے کے لیے یہ مشورہ دیتے تھے کہ انگریزوں کے ساتھ مقاومت اور ٹکراؤ کے بجائے مفاہمت کا رویہ اپنائیں؛ مولانا حالی سرسید کے اس طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سرسید کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ ہندوستان کے ساتھ کوئی برتاؤ انگریزوں کی طرف سے ایسا نہ ہو جو ہندوستانیوں کی ذلت کا باعث ہو خصوصاً مسلمانوں کی جانب سے انگریزوں کی بدگمانی رفع کرنے میں انھوں نے کوئی دقیقہ کوشش و تدبیر کا فروگذاشت نہیں کیا۔"[1]

غرض سیاسی سطح سے لے کر علمی محاذ تک سرسید کا یہی طریقہ کار تھا جس پر وہ نہایت نیک نیتی سے قائم تھے، تفسیر القرآن کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ خود سرسید اپنی عقلی توجیہات سے مطمئن نہ تھے بلکہ وہ مخالفین کے پروپیگنڈہ سے متاثر تھے، مثلاً وہ اپنی تحقیق میں ملائکہ اور شیاطین کے وجود کی نفی کرتے ہیں اور ان کو مجموعہ قوائے ملکوتی و قوائے بہیمی بتاتے ہیں جو ہر قسم کی نیکی اور بدی ظاہر ہوتی ہیں[2]، مگر خود ان کے متعلق اپنا عقیدہ یہ بتاتے ہیں:

"ملائکہ کے وجود سے ہم کو انکار نہیں، جس قدر اختلاف ہے وہ صرف ان کی حقیقت و ماہیت کی نسبت ہے۔"[3]

داخلی ردعمل | سرسید کے نزدیک خرق عادت اور معجزات کی تاویل و توجیہ کا ایک اہم

[1] مولانا حالی، حوالہ سابق، ج ۲، ص ۱۶۴ [2] سید احمد خاں، تفسیر، ج ۱، ص ۴۹ [3] ایضاً جلد سوم ص ۲۴

سبب یہ بھی تھا کہ ان کے دور میں پیر پرستی و گور پرستی کا کاروبار عروج پر تھا اور اس قسم کے لوگ کرامات کا سہارا لے کر لوگوں کو مرعوب کرتے تھے، چنانچہ معجزات اور کرامات کے درمیان فرق و امتیاز کئے بغیر سرسید نے اس گھناؤنے کاروبار کے ردعمل میں بھی سخت موقف اختیار کیا، جس کا اندازہ ان کی درج ذیل تحریر سے بخوبی ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"ہماری سمجھ میں کسی شخص میں معجزے یا کرامت کے ہونے کا یقین کرنا ذات باری کی توحید فی الصفات پر ایمان کو ناقص اور نامکمل کر دیتا ہے اور اس کا ثبوت پیر پرست و گور پرست لوگوں کے حالات سے جو اس وقت بھی موجود ہیں اور صرف معجزے اور کرامت کے خیال نے ان کو پیر پرستی و گور پرستی کی رغبت دلائی ہے اور خدائے قادر مطلق کے سوا دوسرے کی طرف ان کو رجوع کیا ہے اور منتیں ماننا، نذر و نیاز چڑھانا، ان کے نام کے نشانات بنانا اور جانوروں کی بھینٹ دینا سکھایا ہے بخوبی حاصل ہے اسی وجہ سے ہمارے سچے ہادی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ہمارے سچے خدا وحدہٗ لاشریک لہٗ نے صاف صاف معجزات کی نفی کر دی تاکہ توحید کامل بندوں کو حاصل ہو۔"[1]

احکام اسلام کی غلط ترجمانی

تفسیر القرآن کا ایک کمزور پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں متعدد اسلامی احکام کی تشریح صحیح نہیں کی گئی ہے، مثلاً سود کے مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے سرسید لکھتے ہیں:

"بہت سے معاملات قرضے کے ہیں جو تجارت کے کاروبار میں پیش آتے ہیں اور ایسے بینکوں کے قائم ہونے سے جو سود پر تجارت کے مقاصد کے لیے روپیہ قرض دیتے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ روپیہ پہونچاتے ہیں اور ہر قسم کی آڑتوں کا کام کرتے ہیں اور جن سے تجارت کو اور ترقی ملک کو اور افزونی آبادی کو نہایت امداد پہونچتی ہے، ان معاملات میں جو سود کہ لیا دیا جاتا ہے، مجھکو قرآن مجید کی رو سے اس کے ایسے ربا ہونے جس کو اس آیت میں حرام کیا ہے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، پس حکم ربا کا جو قرآن مجید میں ہے وہ نہایت اخلاق و نیکی پر مبنی ہے اور اسی طرح ترقی تجارت و ترقی ملک و دولت کا مانع نہیں ہے، فقہاء نے بلاشبہ اپنے اجتہاد اور قیاس سے ایسی قیدیں بڑھا دی ہیں جن سے ربا حکم تجارت کی ترقی کا مانع قوی ہو گیا ہے، مگر قرآن مجید سے ایسا نہیں پایا جاتا۔"[1]

اسی طرح قربانی جو ایک مذہبی حکم ہے اس کے بارہ میں وہ رقم طراز ہیں:

"انسان کے گناہوں کے کفارہ میں قربانی کرنا اور انسان کے جرم کے سبب ایک جانور مارنا اور یہ سمجھنا کہ انسان اس گناہ سے پاک ہو گیا ایک عجیب و غریب خیال ہے جو نہایت تاریکی اور جہالت کے زمانہ میں لوگوں کو پیدا ہوا تھا..... کسی قربانی کا حکم بطور انسانی گناہ کے کفارہ کے قرآن مجید میں نہیں آیا ہے، حج کی قربانیاں درحقیقت مذہبی قربانیاں نہیں ہیں اور نہ انکی فرضیت قرآن مجید سے یا نص صریح سے پائی جاتی ہے یہی سبب ہے کہ ہمارے علمائے مجتہدین نے کتب فقہ میں کسی قربانی کو فرض نہیں تحریر کیا ہے، زیادہ سے زیادہ جو کوشش کی ہے تو واجب لکھا ہے اور ہم کو اس میں بھی کلام ہے۔"[2]

درحقیقت قرآن مجید کی تفسیر کا کام بڑا نازک اور اہم ہے، اسی لیے علمائے اسلام نے

۱؎ سید احمد خاں' حوالہ سابق ج ۳، ص ۲۵، ۲۹۔

۱؎ سید احمد خاں' حوالہ سابق' ج ۱، ص ۳۰۶ ۲؎ ایضاً ج ۵، ص ۹۴، ۹۵۔

ایک مفسر کے لیے بہت سے اوصاف و خصوصیات کا حامل ہونا ضروری قرار دیا ہے، سرسید احمد خاں مرحوم اپنی گوناگوں خوبیوں اور کمالات کے باوجود قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کے اہل نہ تھے، اسکا اعتراف ان کی تحریک سے متاثر اور ان کے خدمات و کمالات کے قدر داں لوگوں نے بھی کیا ہے، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی مرحوم تحریر فرماتے ہیں :

"سرسید کی تصانیف ماقبل غدر سررشتہ و قانون، سیرت و تاریخ، تصوف اور مذہبی مناظرہ سے تعلق رکھتی ہیں، بعد غدر انہیں مباحث میں پالیٹکس اور تعلیم کا اضافہ اور ہوگیا، کوئی رسالہ یا کتاب تفسیر یا ادب سے تعلق نہیں رکھتی نہ حیات جاوید سے کہیں اس امر کا سراغ ملتا ہے کہ سرسید نے تفسیر کا مطالعہ باقاعدہ کیا ہو، ہاں اسکا ثبوت ہے کہ انکی نظر اس فن میں نہایت محدود تھی"[1]

سرسید احمد خاں مرحوم کی تفسیر القرآن پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے بڑی جامع مثال دی ہے' اس کی حیثیت شَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ أَهْلِهٖ[2] کی ہے، ہم اسی پر یہ مضمون ختم کرتے ہیں، نواب صاحب لکھتے ہیں:

"ہمارے خیال میں سرسید کی تفسیر نگاری کی مثال بعینہ ایسی ہے کہ ایک طوفان خیز سمندر میں جہاز کو ایسا کپتان لے جائے جو نہ کسی بحری مدرسہ کا تعلیم یافتہ ہو اور نہ کسی ماہر استاد کی صحبت میں اس نے جہاز رانی سیکھی ہو اور محض ضرورت وقت پر لحاظ اور اپنی عقل پر بھروسہ کرکے جہاز کو لے چل کھڑا ہو، ظاہر ہے کہ ایسے جہاز کا انجام کیا ہوگا؟"[3]

---

[1] مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی' حوالہ سابق، ص ۵۶ [2] قرآن مجید میں مِنْ أَهْلِهَا تھا لیکن موقع کے لحاظ سے یہاں مِنْ أَهْلِهٖ کر دیا گیا ہے [3] مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی، حوالہ سابق' ص ۵۹۔

مولانا فضل حق خیر آبادی کا ایک تاریخی قصیدہ

از

جناب کالی داس رضا گپتا، بمبئی۔

"جون سنہ ۹۴ء کے معارف میں جناب عتیق جیلانی سالک رام پور کا مضمون "امتیاز علی عرشی اور بعض علمی مباحث" کے عنوان سے شایع ہوا ہے، اس میں ۱۸۵۷ء کے جہاد اور اس سے متعلقہ مولانا فضل حق خیرآبادی کے فتوے کے بارے میں عرشی صاحب اور مالک رام صاحب کے "رائے عام" سے اختلاف کا ذکر تھا، جناب کالی داس رضا گپتا صاحب کا نقطۂ نظر رائے عام کے علاوہ ان دونوں حضرات کے موقف سے بھی مختلف ہے گو ان کا یہ مضمون مطبوعہ ہے تاہم سالک صاحب کے مضمون کی اشاعت کے بعد اس کو شایع کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ یہ تیسرا پہلو بھی اصحاب علم و نظر کے سامنے رہے"۔ (ض)

انیسویں صدی کے پہلے نصف میں بہ لحاظ علم و ادب جن مشاہیر کا سکہ چلتا تھا ان میں مولانا فضل حق خیرآبادی (سنہ ۱۷۹۶ء تا سنہ ۱۸۶۱ء) سر فہرست ہیں، اعلیٰ دماغی صلاحیتوں کے باعث وہ علماء میں مقام بلند رکھتے ہیں اور ان کا جلایا ہوا چراغ علم و فضل آج بھی مجلسوں کو جگمگا رہا ہے۔

مگر جہاں وہ بلاشبہ معقولات میں اپنے وقت کے امام سمجھے گئے وہاں کالے پانی کی سزا

کے پیش نظر انہیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ہیرو بھی قرار دیا گیا اور ان کے اس پہلو سے متعلق ایسی ایسی باتیں گھڑلی گئیں کہ اہل تحقیق کی نظر میں ان باتوں کا کسوٹی پر کسا جانا ضروری ہوگیا چنانچہ اس کام کو پہلے مولانا امتیاز علی عرشی نے اپنے مضمون "مولانا فضل حق خیرآبادی اور ۱۸۵۷ء کا فتویٰ جہاد" (تحریک، ۱۱ اگست ۱۹۵۷ء) کے ذریعہ اور پھر مالک رام صاحب نے اپنے مضمون "مولانا فضل حق خیرآبادی" (تحریک، جون ۱۹۶۰ء) کے ذریعہ پورا کیا اور ثابت کیا کہ نہ صرف مولانا فضل حق نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں کوئی حصہ نہیں لیا بلکہ وہ آخر تک اس سے اپنی بے تعلقی اور عائد کردہ الزامات سے بے گناہی ثابت کرنے کے لیے پوری تگ و دو کرتے رہے۔

یہ دونوں مضامین اپنی جگہ نہایت مدلل ہیں، پہلے مضمون کا انحصار مولانا کے اس خط پر ہے جو انھوں نے نواب یوسف علی خاں والئ رام پور کو لکھا تھا اور دوسرے مضمون کی بنیاد عمارت حکومت کے ان پرانے کاغذات پر کھڑی کی گئی ہے جن میں اصل مقدمے کے کوائف محفوظ ہیں۔

مالک رام صاحب نے مضمون بڑی تفصیل سے لکھا ہے اور ہر مفروضے کے خدوخال حقیقت کی روشنی میں ظاہر کر دیے ہیں، آج تک یہ مانا جاتا رہا ہے کہ

۱۔ مولانا فضل حق مرحوم پر مقدمہ، جس میں انہیں بالآخر کالے پانی کی سزا ہوئی، سلطنت مغلیہ کی وفاداری یا فتویٰ جہاد کی پاداش یا جرم بغاوت کی بنا پر قائم ہوا تھا۔

۲۔ منصفِ عدالت مولانا کا شاگرد تھا اور وہ چاہتا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں۔

۳۔ جیوری میں ایک اسیسر بھی مولانا کو بری کر دینے کے حق میں تھا۔

۴۔ مولانا خود استغاثہ کے بیانات اور دلائل کو "تارِ عنکبوت" کی طرح توڑ دیتے تھے

اور اس بنا پر وہ بری کر دیے جاتے مگر انھوں نے خود اقرار کیا کہ جس فتوے کی بنا پر مقدمہ قائم ہوا ہے وہ صحیح اور میرا لکھا ہوا ہے۔

۵۔ اس اقرار اور اقبال کے بعد عدالت نے "بہ صد رنج و غم کے ساتھ" مولانا کے لیے کالے پانی کا حکم سنایا۔

۶۔ مولانا نے یہ حکم کمال خندہ پیشانی سے سنا۔

مالک رام صاحب نے مندرجہ بالا تمام دعوں کا مقدمے کی اصل مِسل کو سامنے رکھ کر جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ:

۱۔ مولانا نے ایسا کوئی فتویٰ نہیں دیا تھا جس میں لوگوں کو جہاد کی ترغیب دی گئی ہو۔

۲۔ مقدمہ کپتان تھربرن اور اس کے بعد جارج کیمبل اور میجر بارو کی مشترکہ عدالت میں ہوا تھا اور ان تینوں کا مولانا سے شاگردی کا رابطہ ممکن نہیں۔

۳۔ یہ عدالت فوجی قسم کی تھی ایسی عدالتوں میں جیوری ہوا ہی نہیں کرتی لہٰذا اسیسر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۴۔ مولانا بار بار (مقدمے کے دوران) یہی کہتے ہیں کہ میں نے بغاوت میں کوئی حصہ نہیں لیا اور فتوے جہاد پر جن علماء کے دستخط ہیں ان میں سرے سے مولانا کا نام ہی نہیں۔

۵۔ جوڈیشل کمشنر لکھتا ہے کہ مولانا کو سخت ترین سزا ملنی چاہیے اور انہیں جلاوطن کر دینا چاہیے عدالت یہ فیصلہ "بہ صد رنج و غم کے ساتھ" کیوں سناتی۔

۶۔ جب مولانا اپنی پیرانہ سالی اور اپنی اولاد کی صغر سنی اور عسیر الحالی کا دردناک قصہ بیان کر کے حکومت سے رحم کی التجا کرتے ہیں کہ مجھے رہا کر دیا جائے تو وہاں "خندہ پیشانی" سے فیصلہ سننے کا کیا مقام ہو سکتا ہے۔

مالک رام صاحب ان تمام داستانی باتوں کی تغلیط کے بعد فرماتے ہیں:

"آج تک ان (مولانا) کی نسبت جو غلط باتیں مشہور رہی ہیں، دراصل یہ نتیجہ تھیں ہماری اس خواہش کا کہ ہم انہیں ...... "جنگ آزادی" میں بھی برابر کا شریک دیکھنا چاہتے تھے ...... اب کہ حقیقت واشگاف ہو کر ہمارے سامنے جلوہ فروز ہو گئی ہے ہمیں اپنی گذشتہ غلطیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہیے ...... مرحوم کی عزت اسی میں ہے کہ ہم انہیں (مولانا کو) ان کے صحیح مقام پر بٹھائیں نہ کہ غلط باتیں ان سے منسوب کر کے ان کا ایک فرضی بت بنائے رکھیں، جو ممکن ہے خوبصورت تو ہو لیکن اصل سے اس کا کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہوگا ...... "

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مالک رام صاحب کا یہ مضمون نہایت مفصل ہے جسے پڑھے بغیر مقدمے کی تفصیلات اور مولانا کے عاجزانہ اور ملتجیانہ بیانات جن میں بار بار بے گناہی جتائی گئی ہے اور رہائی کی درخواست کی گئی ہے [1] گرفت میں نہیں آسکتے اور چونکہ یہ سب تحریریں حکام وقت اور مولانا یا ان کے وکیل کے دستخطی ہیں اس لیے ان کی صحت قطعی مشکوک نہیں۔

اب صاف ظاہر ہے کہ جہاں تک مولانا فضل حق خیرآبادی اور ان کے مقدمے اور آل کار کالے پانی کی سزا کا تعلق ہے عام روایتیں نادرست ہیں۔ عرشی صاحب اور مالک رام صاحب

[1] مولانا لارڈ کیننگ وائسرائے اور گورنر جنرل کو ایک درخواست میں لکھتے ہیں "اب میری عاجزانہ درخواست ہے کہ جو کچھ صدر میں اسپیشل کمشنروں کے فیصلے کے خلاف قانون ہونے سے متعلق لکھا گیا ہے اس پر غور کیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ خواہ شاہی اعلان کے مطابق انصاف کیا جائے یا ایک پیرانہ سال بوڑھے اور اسکے متعدد بے بس افراد خاندان پر رحم کو مدنظر رکھا جائے، بہرحال میری رہائی اور جائداد کی بحالی کے احکام صادر فرمائے جائیں گے"

نے ایمانداری سے تحریری شہادتیں پیش کر کے ثابت کر دیا کہ مقدمے کے دوران اور اس کے بعد انتقال (۱۸۶۱ء) تک مولانا نے صورت حال کا جیسا بھی مقابلہ کیا اسے ان کے مقام کو دیکھتے ہوئے کسی بھی حالت میں جرأت مندانہ نہیں کہا جا سکتا ــــــ اسی طرح اس عرصے میں انھوں نے جو بھی بیان دیے وہ متہورانہ بیانات میں شمار نہیں کیے جا سکتے۔ تاہم میری ذاتی رائے ہے کہ مقدمے اور مابعد کے رویے سے قطع نظر جو میرے خیال میں مولانا نے اپنی جان بچانے اور رہائی حاصل کرنے کے لیے اختیار کیا تھا وہ "جنگ آزادی" سے پورے طور پر متاثر تھے۔ انھوں نے اس جنگ میں عملی طور پر حصہ لیا ہو کہ نہ لیا ہو وہ جذباتی طور پر جنگ آزادی سے قطعی طور پر ہم آہنگ تھے اور فرنگیوں کی مخالفت میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ اس کا ثبوت مولانا کا ایک غیر مطبوعہ قصیدہ فراہم کرتا ہے۔ اس کے اقتباسات تو آگے چل کر پیش کیے جائیں گے۔ پہلے قصیدہ کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے ضروری سنین کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔

جب ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں "جنگ آزادی" کا آغاز ہوا تو مولانا فضل حق الور میں تھے۔ ۱۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو الور میں مہاراجہ بنے سنگھ کا انتقال ہو گیا اور بقول مولانا وہ مہاراجہ کی وفات کے ایک ماہ بعد یعنی ۱۵ اگست ۱۸۵۷ء کو دلی کے لیے روانہ ہوئے۔ جیون لال اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے کہ مولانا ۱۶ اگست (عبداللطیف کے مطابق ۱۹ اگست) کو بہادر شاہ ظفر کے دربار میں شامل تھے اور انھوں نے نذر پیش کی۔ اسی زمانے میں سر جان لارنس پنجاب سے کمک لے کر دلی پہنچا۔ ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو جب انگریزی فوج فاتح ہو کر دلی شہر میں داخل ہوئی تو مولانا شہر ہی میں موجود تھے۔ پانچ دن تک شہر کے گلی کوچوں میں دست بدست مڈبھیڑ ہوتی رہی اور آخر کار ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شہر مکمل طور پر انگریزی

فوج کے قبضے میں آ گیا۔ بقول مولانا پانچ دن بعد ۱۹ ستمبر یا ۲۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو میں "خدا پر بھروسہ کر کے بیوی بچوں کو ساتھ لے کر (الور کو) چل کھڑا ہوا۔ چونکہ بار برداری کا سامان مہیا نہیں تھا اس لیے سارا سامان اور کتابیں اور مال وغیرہ یہیں (دلی میں) چھوڑا"۔

اہل و عیال کو الور میں چھوڑ کر مولانا نے دسمبر ۱۸۵۷ء میں خیرآباد کی راہ لی خیرآباد کے علاوہ چندے کھیڑی، ہرگاؤں، تنبولی، سہورپور، دریہ وغیرہ میں رہے اور ۲۶ دسمبر ۱۸۵۸ء کو انھوں نے سیتھا کے مقام پر کرنل کلارک سے ملاقات کی۔ جنھوں نے حکم دیا کہ مولانا کو ڈپٹی کمشنر ضلع کی تحویل میں دے دیا جائے۔ مولانا ۳۰ دسمبر ۱۸۵۸ء کو ڈپٹی کمشنر کے سامنے حاضر ہوئے اور اپنے مکان ہی پر ٹھہرے رہے۔ جنوری ۱۸۵۹ء کو ڈپٹی کمشنر نے انہیں لکھنؤ روانہ کر دیا۔ مقدمہ ۲۲ فروری ۱۸۵۹ء کو کپتان تھربرن (لکھنؤ) کی عدالت میں پیش ہوا۔ ۴ مارچ ۱۸۵۹ء کو مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا۔ مئی ۱۸۵۹ء میں انھیں لکھنؤ سے مختلف جیلوں میں رکھتے ہوئے کلکتہ پہنچایا گیا اور وہاں سے فایر کوئین (Fire Queen) نامی جہاز میں انڈمان بھیج دیا گیا۔ جہاز ۸ اکتوبر ۱۸۵۹ء کو پورٹ بلیر پہنچا۔ ایک سال دس مہینے تیرہ دن بعد ۲۰ اگست ۱۸۶۱ء کو مولانا نے وہیں انتقال کیا۔

میرے کتب خانہ میں عربی کی ایک قلمی کتاب ہے جس میں سات چھوٹے بڑے رسائل شامل ہیں۔ جن کو اصلی خطی نسخے سے نقل کیا گیا ہے[2]۔ ان میں مولانا فضل حق خیرآبادی کے چھوٹی بڑی بحروں کے ۱۶ قصیدے ہیں۔ تین قصائد نونیہ ہیں۔ ایک قصیدہ نونیہ کا موضوع انگریزوں کے ہاتھوں دلی کی تباہی و بربادی اور مصنف کا دلی سے نکلنا ہے اور یہاں

[1] دہلی میں مولانا کی ایک بیوی اعزاز بیگم اپنے دونوں صاحبزادوں شمس الحق اور علاء الحق کے ساتھ محلہ بلی ماران میں مقیم تھیں۔ [2] کتاب کا مکمل تعارف آئندہ پیش کیا جائے گا۔

اسی قصیدے کا لب لباب پیش کرنا مقصود ہے[1]۔ چونکہ قصیدے میں دلی کی تاراجی کے بعد دلی سے نکل کر منزل پر پہنچنے کا حال درج ہے اس لیے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ قصیدہ ستمبر ۱۸۵۷ء کے تیسرے یا چوتھے ہفتے اور دسمبر ۱۸۵۷ء (خیرآباد کو روانگی) کی درمیانی مدت میں کہا گیا ہوگا۔ اگر قصیدہ خیرآباد پہنچ کر کہا گیا ہوتا تو اس میں خیرآباد کے سفر کا حال بھی درج ہوتا۔ اس لیے قصیدے کی تاریخ فکر اکتوبر یا نومبر ۱۸۵۷ء مقرر کی جا سکتی ہے۔

قصیدہ

میں اپنے معشوق کے ساتھ جس کے جمال و کمال کی توصیف ممکن نہیں بڑی پُرمسرت زندگی گزار رہا تھا کہ اچانک ایسے حادثات گزرے جو میرے اس کے درمیان حائل ہو گئے اور وصل کے تمام اسباب منقطع اور راہیں مسدود ہو گئیں۔ محبت کی باتیں کہانی بن گئیں اور طوفان نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔

وہ طوفان یہ ہے کہ نصاریٰ تمام دنیا کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں وہ اپنے مدعا کو سینے میں چھپائے، حیلوں بہانوں سے دینِ عیسوی کو پھیلانے اور بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ ہر عہد کو توڑ دیتے ہیں اور فریب و ضلالت پر کمربستہ ہیں، جس ملک کو غصب کرتے ہیں ظلم و طغیان میں حد سے گزر جاتے ہیں، کمینوں، ذلیلوں کو ابھارتے ہیں تاکہ شریف ختم ہو جائیں اور مدرسے بناتے ہیں تاکہ بچے بگڑ جائیں، ان کے مدرسوں میں لغویات، مکروہات، بہتان، عیاری و مکاری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ انھوں نے تمام لوگوں کا رزق چھین رکھا ہے چاہے وہ صناع ہوں یا کاشتکار، ان کا فیصلہ فریقین کا مال سلب کر لیتا ہے اور ان

[1] اس قصیدے کے صحیح مفہوم کے لیے ایک عربی عالم سے مدد لی گئی ہے اور وہی اس کی صحت کے ذمہ دار ہیں۔

بے چاروں کو حزن وندامت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا، جب ان مکاروں نے شاہانِ ہند کو لہو
ولعب میں مشغول اور کمزور دشست پایا تو آہستہ آہستہ ملک پر چھا گئے اور جب یہ جان لیا
کہ حالات موافق ہیں تو اپنے لشکریوں کو کھلم کھلا تثلیث کی طرف دعوت دینی شروع کر دی؛
فوجیوں میں اکثر ہندو تھے اور تھوڑے مسلمان، لیکن دونوں کی حمیت نے نصاریٰ کے قدم
روک دیے، ان انگریزوں نے ان ہندو مسلمانوں کو گائے اور سور کی چربی کھانے پر مجبور کیا
تاکہ دونوں فرقوں کے لوگ بے دین ہو جائیں اور ہماری طرف آجائیں، کیونکہ ایک فرقہ گائے
کو پوجتا ہے اور قرآن شریف کے ماننے والوں کے یہاں سور نجس العین اور شیطان کی گندگی
مانا جاتا ہے۔ چنانچہ جب ان لشکریوں نے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا تو انگریزوں نے
ان پر سختی وتشدد کے آلے کو آزمایا، لشکریوں نے جواب میں الٹا ان ہی کو دھر لیا اور ان کی
طرف اسلحہ لے کر پلٹ پڑے، چنانچہ لشکر کے بہت سے سردار قتل کر دیے گئے۔ یہی نہیں بلکہ
ان کی عورتوں بچوں وغیرہ کسی کا لحاظ نہ کیا۔ سب کو مارا، زخمی کیا، اموال لوٹے، مکانات جلائے
اور اس طرح ملک ہند میں افراتفری وانتشار عظیم پیدا ہو گیا۔ کوئی حاکم رہا نہ نگراں، سب کو اپنی
جان کے لالے پڑ گئے، جان ومال، ناموس، آبرو کسی کے تحفظ کا سہارا نہ رہا، عجیب ہلڑ مچا اور
امن وسکون تہہ وبالا ہو گیا۔ غنی مفلس ہو گئے اور مفلس مالدار۔ عزت والے بے عزت اور
کمینے معزز وبارعب؛ غرض کہ سب الٹ پلٹ ہو گیا۔ امن وامان کا خاتمہ ہو گیا۔ فتنہ پھیلتا گیا
اسباب تمام لشکری ایک بزدل وکمزور شخص کے گرد جمع ہو گئے۔ جس کا نام بہادر شاہ تھا
اور دہلی پر قبضہ کر لیا۔ ان کے ارادے غیر مستقل؛ اندازے غلط وبے سود۔ نہ ان میں دین نہ
ایمان؛ جو نظر آیا اسے لوٹ کھایا۔ ایک بڑا گروہ زناکاری میں لگ گیا اور ہزاروں عورتوں کی
عزت وناموس پر ڈاکہ ڈال کے ان کو بدکار بنا دیا۔ پیشہ ور بدکار عورتوں کی چاندی ہو گئی؛ انکا

حکم چلنے لگا۔ کچھ صرف مال جمع کرنے پر ادھار کھائے ہوئے تھے۔ تو کچھ بھوکے پیاسے اور
تباہ حال۔ بعض ان میں اسلحہ کا استعمال بھی اچھی طرح نہ جانتے تھے، ادھر یہ دھینگا مشتی مچی
ہوئی تھی۔ ہر کوئی اپنے میں مست تھا۔ دوسری جانب نصاریٰ خندقیں کھود رہے تھے اور فصیلیں
بنا رہے تھے۔ انھوں نے اونچی اونچی پہاڑیوں پر پہنچ کر دمدمے نصب کر دیے اور افواج
کثیر کو چاروں طرف پھیلا کر شہر دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے بعد آتشیں اسلحہ بندوق وتوپ
وتفنگ کا کمال دکھلانے لگے۔ شہر دھوئیں سے بھر گیا۔ ہر طرف آگ آگ بھاگ بھاگ مچا
ہوا تھا۔ ہزاروں افراد بھسم ہو گئے۔ مارے گئے، زخمی ومعذور لوگوں کا کچھ حساب نہ رہا۔
افسوس کہ لشکر دہلی میں کچھ مخلص مجاہدین بھی تھے، لیکن ان غریبوں کے پاس تھا کیا؟ نہ
لباسِ جنگ، نہ رسد، نہ اسلحہ، بیچارے تلوار اور گھوڑے لے کر لڑنے آئے تھے۔ انھوں نے
بہت سخت جہاد کیا اور اللہ کی رضا کے مستوجب ہو گئے لیکن قدیم آلات جنگ کے باعث
ہزیمت اٹھائی۔ ان کے علاوہ باقی لشکر زیادہ دیر ٹک نہ سکا اور تتر بتر ہو گیا۔ فرار کی
صورتیں ڈھونڈنے لگا۔ انگریزوں نے یلغار شروع کر دی اور حال یہ تھا کہ جسے پاتے
موت کے گھاٹ اتار دیتے۔ انگریزی فوج دندناتی چلی آتی تھی اور قتل وغارت کا بازار گرم
تھا۔ دہلی کے رہنے والوں نے یہ سماں دیکھا تو بھاگنا شروع کیا اور اس کے بعد لوٹ مار،
قتل وغارت، بے رحمی وشقاوت کا حال وہ ہوا جو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ گھروں کو
ڈھا دیا گیا۔ عمارتیں توپوں سے اڑا دی گئیں۔ راستے ویران بنا دیے گئے۔ درخت تک
آگ میں جھلس گئے۔ وہی لوگ بچ گئے جو بھیس بدل کر چھپ چھپا کر راتوں رات بھاگ لیے
ورنہ پورے شہر دہلی کے باشندے دشمنوں کے قیدی ہو گئے اور قبرستان جیسا خوف اور
سناٹا کئی روز تک طاری رہا۔ ہائے ہائے نصاریٰ پیر پٹکتے اور اکڑتے ناچتے چلتے تھے اور
ہر گلی کوچے میں گشت لگاتے تھے اور اہل دہلی حیران، سوختہ سامان نیم مردنی کے عالم میں

آسمان کو تکتے تھے، باپ بیٹے سے دور، بھائی بھائی سے الگ، بیوی کو شوہر کی خبر نہیں۔ بچے ماں کے لیے روتے پھرتے اور مائیں بھوک اور حزن سے گریاں۔ کھانے کو ماش، پینے کا پانی شور، ہر قسم کی ذلت وصعوبت کا اجتماع، شریف عورتوں کی عصمت اور عفت کا خدا ہی نگہبان تھا۔ پردہ دار خواتین کے جسم پر پھٹے ہوئے لباس تھے لیکن اپنی عریانی کا ہوش ہی نہ تھا۔ بے چاریاں ایک طرف منہ اٹھائے بھاگی جارہی تھیں۔ کتنی تو راستے میں ہلاک ہوئیں اور نہ جانے کتنی کوئیں اور دریا میں کود پڑیں کیونکہ نصاریٰ کے لشکر ان کے پیچھے پڑے تھے اور جو بھی مل جاتا اس کے ساتھ شقاوت و بے رحمی کی انتہا کر دیتے تھے۔

بادشاہ قید کر لیا گیا۔ اس کے چار جوان بیٹوں کے سر کاٹ کر اس کے پاس بھیجے اور لاش کو سولی پر چڑھایا۔ ملکہ کو قصر کے بدلے قید خانہ آباد کرنا پڑا۔ ان انگریزوں کے ظلم سے شاید ہی کوئی بچا ہو۔ یا تو وہ جس نے بھیس بدل لیا ہے یا کسی قریبی گاؤں میں بھاگ کے چھپ کر بیٹھ گیا ہے۔ آل تیمور اور چرچان کے بادشاہوں کی اولاد نے ہزاروں کی تعداد میں پھانسی کی سزا پائی۔ نہ کسی عالم کو چھوڑا۔ نہ قدیم نشان کو، نہ قرآن کو بخشا۔ تمام مسجدیں ڈھادیں سوائے دو ایک کے اور اس میں بھی نماز کی مناہی کر دی۔ شہر کو اس طرح برباد کیا کہ قصر و ایوان ایک نہ بچا۔ جس نے نصرانیوں کی مدد کی اسے آسمان پر چڑھا دیا۔ یہ کمبخت لوگ بے رحمی اور درندگی میں شیطنیت میں ان سے بھی دو قدم آگے تھے۔ جب میں نے دیکھا کہ دشمن کسی کو معاف کرنے والا نہیں اور مقابلے کا کوئی سوال نہیں تو میں نے بھی دکھے ہوئے دل سے دہلی کو خیر باد کہا مگر ہر قدم پر خوف تھا کہ نصاریٰ کے جاسوس دھر دبائیں گے اس لیے میں نے دور دراز کا راستہ اختیار کیا۔ ناقابل عبور ندیوں کو پار کیا۔ خدا ہی میرا بچانے والا تھا۔ ورنہ جگہ جگہ مجھے دشمن کی آنکھیں گھورتی نظر آتی تھیں، جب میں اپنے اہل وعیال سے آملا تو لوگوں نے نذریں اتار لیں اور کئی دن تک تہنیت کا سلسلہ چلتا رہا۔

اخبار علمیہ

انسان کا جدِ اعلیٰ سب سے پہلے دنیا کے کس خطہ میں آباد ہوا؟ اس سوال کی تحقیق میں سائنسداں عرصہ سے سرگرداں ہیں، حال ہی میں اس موضوع پر چند رائیں سامنے آئی ہیں، اسٹیٹ یونیورسٹی نیویارک کے ڈیانے ویڈل اور ٹیکساس یونیورسٹی کے این پوکاک نے اس نظریہ کی تائید میں چند ثبوت اکٹھے کیے ہیں کہ انسان افریقہ میں تقریباً دو لاکھ سال پہلے آباد ہوا، اسے وہ جدید انسان سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن دنیا کے دو ممتاز ترین سائنسی مجلوں 'سائنس' اور 'نیچر' میں شایع ہونے والی جدید تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ملین سال سے بھی پہلے صرف افریقہ میں انسان کے جد اعلیٰ کا وجود تھا، سائنسدانوں نے اب اس مسئلہ کا سراغ بھی کسی حد تک پالیا ہے کہ آخر اس قدیم ترین انسان نے افریقہ سے باہر نکلنے میں ایک ملین سال کیوں لگائے؟ تازہ ترین تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم انسان اب تک کے مفروضہ کے برخلاف افریقہ سے اور زیادہ عرصہ پہلے نکلا، عام طور سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ تقریباً ایک ملین سال پہلے جب کھانے پینے کے پتھر کے برتن زیادہ اچھی شکل میں ایجاد کیے گئے تو یہ اولین انسان ایشیا اور دنیا کے دوسرے خطوں میں پھیل گئے اور حقیقتاً یہی افریقی HOMOERECTUS تھے جو منتشر ہو کر HOMO SAPIENS بنے یعنی جدید انسان کے مورث اعلیٰ ہوئے، لیکن اس رائے کی تائید میں کوئی دلیل نہیں تھی، اب رسالہ 'سائنس' میں بارکلے کے

انسٹی ٹیوٹ آف ہیومن اوریجنس (IHO) کے کارل سوئیشر اور گارنس کرٹس نے لکھا ہے کہ قدیم ترین انسان کے بعض آثار انڈونیشیا کے جزیرہ جاوا میں پائے گئے ہیں یہ ۱۸ ملین سال پہلے کے ہیں یعنی یہ بھی اتنے ہی قدیم ہیں جتنے افریقی آثار۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم انسان نے اپنے افریقی وطن کو لاکھوں برس پہلے ہی خیرباد کہہ دیا تھا، اس تحقیق کی گونج ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ چین کے تین سائنسدانوں نے "نیچر" میں انکشاف کیا کہ چین میں ایک مقام پر ایک سر برآمد ہوا ہے جو ۲۰۰۰۰۰۰ سال قدیم ہے۔ اس سے یہ نظریہ اور پختہ ہوا ہے کہ افریقہ کے علاوہ دنیا کے دوسرے خطوں میں بھی یکساں طور پر قدیم ترین انسان کی نشانیاں ہیں اور یہ کہ شروع سے بنی نوع انسان میں نسلی فرق بڑھنے لگا اور آج کے انسانوں کی طرح ان میں مختلف علاقوں میں مختلف خصوصیات و امتیازات ظاہر ہونے لگے۔

علم معدومیات (PALEONTOLOGY) کا زیادہ اہم اور مشکل سوال یہ ہے کہ بنی نوع انسان کا قدیم ترین مورث اعلیٰ اول اول کہاں آباد ہوا؟ اس تلاش میں اب تک سائنسدانوں کو جو ۵۷ ڈھانچے اور جسم انسانی کے حصے ملے ان میں کوئی کاسۂ سر نہ تھا، ان پنجروں اور ڈھانچوں میں بظاہر اس قدر اختلاف ہے کہ چند سائنسداں اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ نمونے ایک کے بجائے دو انواع انسانی کی جانب اشارہ کرتے ہیں، اب حال ہی میں ایتھوپیا میں ایک کھوپڑی ملی تو یہ بحث بھی قدرے آسان ہوئی، یہ کھوپڑی ایک مضبوط بن مانس جیسی مخلوق کی معلوم ہوتی ہے، اس میں دماغ کا خانہ چھوٹا ہے، جبڑے آگے کی جانب نکلے ہوئے ہیں اور بھنویں گھنی ہیں، اسے سن آف لوسی کا نام دیا گیا ہے (سنہ ۱۹۷۴ء میں افریقہ میں ایک بے سر کا

ڈھانچہ برآمد ہوا تھا اسے لوسی نام دیا گیا تھا) اس دریافت سے سائنسدانوں کے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے کہ نوع انسانی ایک ہی ہے لیکن فرداً فرداً ہر آدمی کی اپنی امتیازی ساخت و شکل ہوتی ہے، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ قدیم انسانوں کی انتہائی لوچ دار طبعی ساخت نے ان کو ایک ملین سال تک بغیر کسی تبدیلی کے محفوظ رہنے کے قابل بنائے رکھا، حالانکہ اس عرصہ میں افریقی آب و ہوا میں متعدد بڑی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔

کوہ آلپس کی بلندیوں میں سنہ ۱۹۹۱ء میں ایک برفانی انسان کی لاش پائی گئی تھی، علم الانسان کے ماہرین نے ۵ ہزار سال پرانی اس لاش کو بڑی اہمیت دی، اس وقت ان سطروں میں اس کا ذکر کیا گیا تھا، اب معلوم ہوا ہے کہ اس لاش کے کپڑوں اور اس کے پاس پائے جانے والے اوزار اور برتنوں کا تجزیہ قریب قریب مکمل ہو چکا ہے اور اب اس لاش کے اندرونی اعضاء کا تجزیہ کیا جا رہا ہے آسٹریا کی انسبرک یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ قدیم و ماقبل تاریخ کے پروفیسر اسپنڈلر نے بتایا کہ اکسرے اور کمپیوٹر کے ذریعہ نسیجوں اور رگوں کا تجزیہ کیا جائے گا، برفانی آدمی کے بچے کھچے کپڑوں کو بھی مرتب کر لیا گیا ہے، حجری عہد کے آخری دور کے انسانی لباس کا یہ پہلا مکمل نمونہ ہے، برفانی انسان کی بے آستین قبا کو جس نزاکت و سبک دستی سے بنایا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کا انسان زیادہ پر تکلف لباس استعمال کرتا تھا، دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ کپڑے بُنے ہوئے نہیں ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کانسے کے عہد تک کپڑے بُننے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی تھی، اس برفانی لاش کے تجزیہ میں دنیا کے مختلف ممالک کے ۶۰

سائنسداں اور متعدد تحقیقاتی جماعتیں مصروف عمل ہیں۔

قدیم انسان کی اولین بود و باش کی تحقیق میں مصروف سائنسدانوں کے علاوہ ماہرین آثار قدیمہ کی ایک جماعت یہ جاننے کی آرزومند ہے کہ انسان نے مویشیوں خاص طور پر گائے بیل وغیرہ کو پالتو بنانے کا عمل کب شروع کیا، ایک خیال یہ تھا کہ تقریباً نو ہزار سال پہلے اناطولیہ میں انسان نے مویشیوں کو اپنے گھر آنگن کا حصہ بنایا تھا، اس عمل سے انسانی تہذیب میں ایک انقلاب آیا اور بعد میں یہ ساری دنیا میں رائج ہوا لیکن اب جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ اناطولیہ ہی کی طرح عین اسی زمانہ میں اس علاقہ میں بھی یہ عمل شروع ہو چکا تھا جو اب پاکستان میں واقع ہے، مشہور زیبو سانڈ اپنے نمایاں کوہان کے ساتھ ہڑپا کی تہذیب میں پایا گیا ہے، اس کے متعلق تحقیق سے یہ معلوم ہوا کہ یہ یوروپی نسل سے زیادہ ایشیائی نسل کا ہے، اس سے یہ تصور بھی غلط ہو گیا کہ تمام گھریلو جانوروں کا مورث اعلیٰ یورپ کا ایک ناپید جنگلی بیل ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ گوز کو یدی، بن ٹنگ اور یاک جیسے ایشیائی جانوروں کی نگہداشت کر کے ایشیا نے ثابت کیا ہے کہ پالتو جانوروں کی اپنی خود ایک نسل ہے۔

کرۂ ارض کے علاوہ کیا نظام شمسی کے اور سیاروں بلکہ ان سے بھی ماورا چند نئے دریافت شدہ سیاروں میں ہماری دنیا کی مانند زندگی کے آثار موجود ہیں؟ اس سوال کے جواب میں سائنسدانوں کا عام خیال ہے کہ ہماری کہکشاں میں ایک ملین سے زیادہ ایسی تہذیبوں کا وجود ہے جو زمین کے باشندوں کی ہم پلہ یا ان سے بھی زیادہ ترقی یافتہ ہیں؟ انکی دید و دریافت کیلئے ہبل اور امریکا کی سوکورو رصدگاہوں کے علاوہ چلی کی ESO رصدگاہ میں نئی طاقتور ترین دوربینیں نصب کی جا رہی ہیں جو عام ریڈیائی لہروں کی بہ نسبت اربوں گنا باریک و نازک ترین اشاروں کو اپنے پیمانہ میں دیکھ سکتی ہیں، اسکے باوجود خیال یہی ہے کہ ان تہذیبوں کی یافت میں شاید صدیاں لگ جائیں۔

ع۔ ص۔

استفسار و جواب

جودھ بائی سے اکبر کے عقد اور اسکی ناخواندگی کا افسانہ

جناب ریاض الحق صاحب م گیا۔ — ۱۔ کیا شہنشاہ اکبر نے جودھ بائی سے نکاح کیا تھا اور کیا نکاح کے بعد دونوں اپنے اپنے مذہب پر قائم تھے؟

۲۔ کیا اکبر ناخواندہ اور جاہل تھے؟ اگر خواندہ تھے تو کیا صاحب تصانیف بھی تھے، کتابوں کے نام سے مطلع فرمائیں!

۱۔ اکبر کی متعدد بیویوں کا ذکر ملتا ہے، ان میں جودھ بائی کا نام بھی لیا گیا ہے، منشی ذکاء اللہ نے صراحتاً لکھا ہے کہ جودھ بائی یعنی جودھپور کی رانی، جہانگیر کی ماں تھی لیکن یہ فاش غلطی ہے، تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ جہانگیر کی ماں راجہ بہارا مل کی بیٹی، راجہ بھگوان داس کی بہن اور راجہ مان سنگھ کی پھوپھی تھی مگر کسی نے ان کا اصل نام نہیں لکھا، صرف بلوکمین نے ایک جگہ اسے جودھ بائی باور کر لیا ہے، لیکن بعد میں دوسری جگہ اس کی تردید بھی کر دی (تاریخ جہانگیر، بینی پرشاد) شاہی حرم میں اسکا لقب مریم الزمانی بیگم تھا، اکبر سے اس کی شادی ۱۵۶۱ء میں بمقام سانبھر ہوئی، اسوقت اکبر نہ بے دین تھا نہ اسلام بیزار بلکہ وہ ایک سنی اور خوش عقیدہ مسلمان کی حیثیت سے معروف تھا، نماز کا پابند، مساجد کی تعمیر کا شائق اور اولیاء و صلحاء کے مزارات کا پابندی سے زیارت کرنے والا تھا، مریم الزمانی بیگم کے دین و مذہب کے متعلق حتمی طور پر کچھ مذکور نہ ہونے کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا مذہب اکبر کے

مذہب سے مختلف تھا، بلکہ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مسلمان ہوگئی تھیں، چنانچہ انکا انتقال ہوا تو جہانگیر نے لکھا کہ "امید کہ اللہ تعالیٰ ایشاں را غریق بحر رحمت خویش گرداند" اور مرنے کے بعد وہ اپنے مرحوم شوہر کے روضہ کے قریب دفن کی گئیں جو آج بھی سکندرہ میں مقبرہ مریم الزمانی بیگم کے نام سے موسوم ہے، اسی لیے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے کہا ہے کہ "اس بات کو نظر انداز کرنا آسان نہیں" (اکبر اینڈ ریلیجن ص ۱۷۰) جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی یہ رائے بھی قابل ذکر ہے کہ "مورخوں نے راجپوت رانیوں کے باضابطہ مشرف بہ اسلام ہونے کا ذکر وضاحت سے نہیں کیا ہے لیکن ان کی کوئی اولاد ہندو نہیں رہی، سب کی سب مسلمان رہیں (تمدنی جلوے ص ۱۲۸) اور مشہور مورخ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے جب یہ لکھا کہ ۱۵۷۰ء میں اکبر نے بیکانیر اور جیسلمیر کی راجکماریوں سے شادی کی تو یہ بھی لکھا کہ "تمام راجپوت دوشیزائیں رسمی طور سے اسلام قبول کرتی تھیں لیکن ان کے رشتہ دار ہندو ہی رہتے، یہ بیگمات اسلام کو زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھیں البتہ وہ اس ضرورت کو تسلیم کرتی تھیں کہ ان کے بچے مسلمانوں کی مانند پرورش پائیں (اکبر، آئی ایچ قریشی ص ۱۴۰) اس سلسلہ میں مرقع اکبرآباد کے مولف سعید احمد مارہروی کی یہ رائے بالکل درست ہے کہ "جودھا بائی کو عام طور سے اکبر کی بیگم اور جہانگیر کی ماں سمجھتے ہیں حالانکہ وہ جہانگیر کی بیگم اور شاہجہاں کی ماں تھی، اصل نام مان متی، خطاب جگت گسائیں اور حرم شاہی میں اس کا لقب بلقیس مکانی تھا، اکبر خود سلیم کی بارات لے کر ان کے محل گیا تھا، مجلس عقد ہوئی، اسلامی طرز سے نکاح ہوا ساتھ ہی شادی کی ہندوستانی اور راجپوتی رسمیں بھی انجام پائیں، ان جودھا بائی نے آگرہ میں ایک محلہ سہاگ پورہ آباد کیا

اور اس میں اپنا مقبرہ بھی تعمیر کرایا (مرقع اکبرآباد ص ۱۸۹) ان کے محل میں مندر بھی تھا اور پوجا پاٹ کے لیے کچھ درخت بھی لگائے گئے تھے، اس کے متعلق لکھا گیا ہے کہ "یہ مندر غالباً جہانگیر کی اس راجپوت رانی کی سہیلیوں اور کنیزوں کے لیے بنایا گیا تھا"۔ (تمدنی جلوے، ص ۱۲۸)

۲۔ اکبر کی تعلیم کے متعلق مورخین کا بیان مختلف و متضاد ہے، ایک طرف تو یہ کہا گیا کہ "اس نے مکتب معلم سے کچھ حاصل نہ کیا، امی ہی رہا" (تاریخ ہندوستان، ج ۵، ص ۱۱) اور یہ کہ "اس نے لکھنا پڑھنا کچھ نہ سیکھا" (مغل رول ان انڈیا، ایڈورڈس اور اوگیرٹ) تو دوسری طرف یہ بھی لکھا گیا کہ "ہمایوں کو اکبر کی تعلیم و تربیت کا بڑا خیال تھا چنانچہ ایام طفلی میں کئی نامور اتالیق و معلم مقرر کیے گئے" اور یہ کہ "(اکبر) بڑی عمر میں لکھنے پڑھنے سے ماہر ہوا، اس کی پڑھنے کی کتابیں مدۃ العمر اس کی اولاد نے تبرکاً اپنے پاس رکھیں" (تاریخ ہندوستان ج ۵، ص ۲۷۷) اس تضاد کے متعلق ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے لکھا کہ "اکبر کے امی محض ہونے کے نظریہ کی تشہیر اسلیے کی گئی کہ اس کی مذہبی روشن خیالی کے دعویٰ کو تقویت پہونچائی جائے"۔ پروفیسر نظامی نے اور وضاحت سے اس ابہام کو یوں آسان کیا کہ "ابوالفضل نے اپنے آقا کی پیغمبرانہ صفات کی تلاش میں اس کا امی ہونا بھی ثابت کرنا چاہا" حالانکہ خود ابوالفضل کی تحریر سے یہ قطعی ظاہر نہیں ہوتا کہ اکبر ناخواندہ اور امی محض تھا ہاں روایتی تعلیم سے اس کی بے اعتنائی ضرور ظاہر ہوتی ہے (اکبر، قریشی) ظاہر ہے محض اس بے اعتنائی کی وجہ سے اس کو بے پڑھا لکھا ثابت کرنا درست نہیں، اس سلسلہ میں پروفیسر نظامی کی یہ رائے بڑی متوازن ہے کہ "اکبر ہوسکتا ہے بہت زیادہ محنتی طالبعلم

نہ رہا ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ اپنے اساتذہ کی توقعات پر وہ پورا نہ اترا ہو لیکن یہ سوچنا بھی قرین انصاف نہیں کہ اس کے سات معلموں کی کوششیں اس کو جہالت سے تعلیم تک لانے میں ناکام رہیں" (اکبر اینڈ ریلیجن، نظامی، ص ۱۸)

۳۔ اکبر کی خود کی کوئی تصنیف نہیں لیکن حصول علم میں اس کے غیر معمولی شوق اور تلاش و تحقیق اور علمی مباحث میں اس کی مکمل دلچسپی اور قابل لوگوں کی سرپرستی کے جذبہ نے بزم تیموریہ کی علمی رونق اور شان و شوکت میں جو اضافہ کیا وہ تاریخ اکبری کا نہایت روشن باب ہے، اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

(ع۔ص)

بزم تیموریہ

از

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم

ہندوستان کے تیموری بادشاہوں یعنی بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، اورنگ زیب اور ان کے بعد کے بادشاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں کے علمی و ادبی ذوق، ان کی علم دوستی و علم پروری و علماء نوازی اور ان کے دربار کے شعراء و فضلا اور دوسرے ارباب فضل و کمال کا مکمل تذکرہ تین جلدوں میں ہے، پہلی جلد میں بابر سے اکبر دوسری جلد میں جہانگیر و شاہجہاں اور تیسری میں اورنگزیب اور بقیہ کا ذکر ہے۔

جلد اول زیر طبع، جلد دوم، ۴۰/-.. جلد سوم ۲۵/-...

منیجر

تلخیص و تبصرہ

تحصیل طب کے وقت محمد بن زکریا رازی کی عمر

از

جناب محمد مشتاق تجاروی، علی گڑھ

"مورخین ارباب تذکرہ محمد بن زکریا رازی کے فضل و کمال اور اس کے یگانہ روزگار طبیب و جالینوس وقت ہونے پر متفق ہیں، لیکن اس نے کس عمر میں علم طب کی تحصیل کی اس کے بارے میں اکثر محققین سے لغزش ہوئی ہے، ڈاکٹر البیر زکی اسکندر نے اس مضمون میں اس غلطی کی تصحیح کی ہے اور علم طب کی تحصیل کے وقت اس کی صحیح عمر کی تحقیق کی ہے، اس لیے قارئین معارف کے لیے اس کی تلخیص پیش کی جاتی ہے۔" (مشتاق)

محمد بن زکریا رازی کی کتابوں میں اس کے متعدد اشارات و شواہد موجود ہیں کہ اسے اپنے وطن رے میں طب سے مناسبت و واقفیت ہو گئی تھی، چنانچہ وہ کتاب الخواص میں لکھتا ہے:

"میں نے رے میں ناریل کے مشابہ ایک پتھر دیکھا ہے، اس میں متعدد سوراخ ہوتے ہیں، اور اس کے اوپر کا حصہ چھال کے مانند ہوتا ہے، ناریل ہی کی طرح اس کے پتھر کے اندر بھی کوئی چیز ہلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، ارسطاطالیس نے اپنی کتاب "الحیوان الناطق" میں لکھا ہے کہ اگر اس پتھر کو بچے کی ولادت کے وقت عورت کے سر پہ لٹکا دیا جائے تو درد زہ نہیں ہوتا اور بچہ کی پیدائش آسانی سے ہو جاتی ہے۔"

لیکن یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ رازی نے کتاب الخواص کب لکھی تھی اور اس نے اپنا مشاہدہ کب اور کہاں تحریر کیا تھا؟

آکسفورڈ کے کتب خانہ بوڈلین کے ایک مخطوطہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رازی نے طب کی تعلیم نوجوانی میں بغداد میں حاصل کی تھی، اس امر کا امکان ہے کہ وہاں اسکا قیام طویل عرصہ تک رہا ہو کیونکہ اسکا بیان ہے کہ طبیب کو علمی مشق کے لیے کسی گھنی آبادی والے شہر میں رہنا لابد ہے، کیونکہ ایسے شہروں میں بیماریاں بکثرت ہوتی ہیں' اس لیے وہاں اطبا کی تعداد بھی کثیر ہوتی ہے، کتاب المنصوری میں "محنۃ الطبیب" کے زیر عنوان لکھتا ہے:

"دیکھنا یہ چاہیے کہ طبیب نے جو کچھ پڑھا ہے اس کی سمجھ بوجھ بھی رکھتا ہے یا نہیں اور اگر وہ اسے سمجھ لیتا ہے تو کیا اس نے مریض کے احوال کا مشاہدہ کیا ہے اور کیا وہ ایسی جگہ رہا ہے جہاں مریضوں اور طبیبوں کی کثرت ہو"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ رازی نے نوجوانی میں بغداد میں علم طب کی تحصیل کی تھی اور مورخین کے بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بغداد سے اس کی اپنے وطن میں واپسی حاکم رے ابو صالح منصور (۲۹۶ ـ ۲۹۰ھ/ ۹۰۸ ـ ۹۰۲ء) کے معالج کی حیثیت سے ہوئی تھی، اس نے اپنی "کتاب الطب الروحانی" کے بارے میں بتایا ہے کہ اسے بھی "کتاب المنصوری" کی طرح حاکم رے کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

اس کا احتمال ہے کہ رازی بغداد سے اس وقت رے واپس آیا ہو جب اس نے اچھا تجربہ اور پوری مہارت حاصل کر لی ہو اور رے کے افسر الاطبا کے عہدہ پر فائز ہونے کے لائق ہو گیا ہو۔ اس وقت راجح قول کے مطابق اس کی عمر ۱۳ اور ۴۳

سال کے درمیان تھی اس کے ایک عرصہ کے بعد وہ بغداد کے شفاخانے میں ملازم ہوا گو دوبارہ بغداد میں اس کے قیام کے سلسلے میں معلومات نہیں ملتے تاہم اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ دوبارہ رے آیا تو اس کی آنکھوں میں نزول الماء کی وجہ سے بینائی ختم ہو گئی تھی اور وہیں اس کا انتقال ہوا۔

مورخین نے رے چھوڑ کر بغداد جانے کے وقت رازی کی عمر تیس (۳۰) یا چالیس (۴۰) سال بتائی ہے جس کے بعد ہی اس نے طب کی تعلیم حاصل کی، اس سے پہلے وہ موسیقی، کیمیا اور علوم طبیعیہ کی تعلیم حاصل کر چکا تھا، لیکن ہمارے خیال میں رازی نے نوعمری ہی میں طبی معلومات جمع کرنا شروع کر دیا تھا، اس کی تائید البیرونی کے بیان کردہ اس کے سنین ولادت و وفات سے بھی ہوتی ہے گو بعض علماء کو اس میں شک و تردد ہوا ہے۔

(۲) بوڈلین (آکسفورڈ) میں ایک خلاصہ موجود ہے جس میں رازی کے نسخوں اور مجربات کا تذکرہ ہے، اس کا نام اس نے "تجارب المارستان" رکھا تھا' اس میں صراحت ہے کہ رازی نے اس کو بغداد میں اپنی نوعمری میں لکھا تھا، اس سے اس متفق علیہ قول کی تردید ہوتی ہے کہ رازی نے مسن ہونے کے بعد طب کی طرف توجہ دی تھی لیکن اس کتاب کے مطالعے سے یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ اس کی ابتدائی دور کی تحریر ہے' اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"جوشاندہ زوفا" کو خشک کھانسی، ضیق النفس اور امراض صدر میں پلایا جاتا ہے، اگر اجابت خشک ہو تو اس میں مغز خیار شنبر ملا دیتے ہیں لیکن اگر اجابت نرم ہو تو اس دوا سے اجتناب کرنا چاہیے اور اس کی جگہ

لعوق لوز پلایا جائے اور بچوں کو اگر کھانسی ہو تو متقلین پلاتے ہیں اور اگر ضیق النفس
اور کھانسی کی شدت ہو تو گدھی کا دودھ پلایا جاتا ہے۔ حب الشیطرج معمولی مسہل
ہے، اسے بدن کو گرم کرنے اور مفاصل (جوڑوں) کے تنقیہ کے لیے پلایا جاتا ہے۔
حب الدیارج کو سر اور آنکھوں کے امراض کے لیے پلایا جاتا ہے۔ اگر پیشاب رنگین
آرہا ہو تو اس کی جگہ جوشاندہ ہلیلہ یا حب ہلیلہ پلایا جاتا ہے اگر اسی کے ساتھ سینہ بھی
جکڑا ہوا ہو تو سادہ جوشاندہ پلانا چاہیے جس میں کسی چیز کی آمیزش نہ ہو، اگر کسی شخص کے
مزاج میں خشکی غالب ہو تو اس کو جو کا پانی اور معتدل مزاج والے کو معتدل شکر کے ساتھ
پلاتے ہیں، جس کے پیٹ میں مروڑ اور ریاح ہو اور اس کو جو کے پانی کی ضرورت
ہو تو اسکو ستو کا پکا ہوا پانی پلایا جائے تاکہ ریاح خارج ہو جائے۔"

رازی کی یادداشتیں جو اس کے انتقال کے بعد "الحادی" کے نام سے منظر عام پر
آئیں ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں اس نے قدیم کتب طب کے اقتباسات
بکثرت دیے ہیں، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ رازی کے معلومات وسیع تھے اور اس نے بغداد
کے کتب خانوں سے مکمل استفادہ کیا تھا جو اس وقت یونانی، ہندی اور سریانی زبان کے
تراجم سے بھرے پڑے تھے، ان یادداشتوں کو لکھتے ہوئے رازی نے حوالہ دینے کا اہتمام
کیا ہے اور دوسروں کے اقوال نقل کرنے کے بعد اسکی تائید یا تردید بھی کرتا ہے وہ ناقص
اقوال کی تکمیل اور مفصل اقوال کا خلاصہ بھی بیان کرتا ہے، رازی کی یادداشتوں کی
ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ بیشتر اس کے تجربات و مشاہدات پر مبنی ہیں۔ اپنی اور
دوسروں کی آراء میں فرق واضح کے لیے وہ اپنی بات لکھنے سے پہلے "لی" ضرور لکھ دیتا ہے۔
جبکہ تجارب المارستان میں یہ لفظ سرے سے نہیں ملتا بلکہ اس میں ہر جگہ اطباء کا

حوالہ ہی دیا ہے، ایک مثال سے ہمارا مدعا پوری طرح واضح ہو جائے گا۔

رازی نے "تجارب المارستان" میں لکھا ہے گر جانے سے جہاں چوٹ آئی ہو
وہاں اطباء فصد کھولتے ہیں جبکہ کتاب المنصوری میں جو ایک اہم علمی تصنیف ہے اور
اس کی اہمیت ہی کی بنا پر اس کا لاطینی میں ترجمہ ہوا ہے اس مسئلہ پر تفصیل سے اس
طرح اظہار خیال کیا ہے:

"اگر کسی سواری وغیرہ سے گر جانے کی وجہ سے چوٹ لگ جائے تو سب سے بہتر
یہ ہے کہ مریض کے مخالف سمت میں فوراً فصد کھول دی جائے، شراب اور
گوشت سے پرہیز کرایا جائے۔ چوٹ کی جگہ پہ مقوی ادویہ کا ضماد یا طلاء کرایا
جائے، اگر چوٹ سر میں ہو تو قیفال کی فصد کھولی جائے اور اس کے بعد سر پہ
سرکہ میں روغن گل ملا کر لگایا جائے اور عرق گلاب پلایا جائے اور اس کا طلاء
کیا جائے اور مریض کو تین دن صبح و شام ماء الشعیر پلایا جائے۔"

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ رازی اپنی نوعمری میں طب کا طالب علم یا نوآموز طبیب
تھا جو بغداد کے شفاخانے میں علاج و معالجہ کی مشق کرتا تھا اور اپنے خاص استعمال
کے لیے معلومات جمع کرتا تھا۔ نیز ان نسخوں سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرتا
تھا جنھیں شفاخانے کے ماہر اطباء استعمال کیا کرتے تھے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے
کہ رازی نے ان کو ایسی کتاب سے نقل کیا ہے جو شفاخانہ کے اطباء کے پاس تھی۔
رازی کے جو مخطوطات دنیا کے مختلف کتب خانوں کی زینت ہیں اگر وہ
دسترس میں آجائیں تو ممکن ہے اس کی شخصیت کے مزید نئے پہلو بھی سامنے آجائیں۔

(ماخوذ از مجلہ الشرق ج ۴ ۵، شمارہ دوم ۔ ۱۹۶۰ء)

معارف کی ڈاک

مکتوب لاہور

لاہور ۳؍اگست ۱۹۹۴ء

فاضل مکرم و محترم جناب اصلاحی صاحب!

السلام علیکم۔ آپ کا محبت نامہ ملا تھا۔ آپ نے جس شفقت آمیز پیرایے میں میرا ذکر کیا ہے اسکا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہوں۔

آپ کے خط آنے سے بہت پہلے میں ترکی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (جلد نہم) پر تبصرہ لکھ کر بھیج چکا تھا جو امید ہے کہ آپ کو مل گیا ہوگا۔

متذکرہ تبصرہ میں دینی موضوعات کے تحت 'دین' 'دین القیم' اور دعا وغیرہ الفاظ کا اضافہ کر دیجیے۔[1]

ترک فاضل فواد سزگین کی "تاریخ التراث العربی" سے آپ بخوبی متعارف ہوں گے۔ اس کی پہلی جلد (قرآن والحدیث)، دوسری جلد (تاریخ و ثقافت) اور تیسری (علم کلام و تصوف) کا میں نے عربی سے اردو میں ترجمہ کر رکھا ہے۔ عرب مترجمین کا ترجمہ اس قدر مختصر اور موجز ہے کہ بعض مطالب تشنۂ وضاحت رہ جاتے ہیں۔ ان لوگوں نے جرمن سے عربی میں ترجمہ کرتے وقت "مکھی پر مکھی مارنے" کی مشق کی ہے۔ میں نے اردو عبارت کو سلیس اور مطلب خیز بنانے کی امکان بھر

[1] معارف چھپنے کے بعد یہ خط ملا تھا اس لیے اضافہ نہیں کیا جا سکا۔

کوشش کی ہے۔

مذکورہ بالا جلدوں کی طباعت اور اشاعت سے قبل جامعۂ امام محمد بن سعود الاسلامیہ (ریاض) کی اجازت ضروری ہے، لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں آرہا ہے، میں دو ماہ سے جامعہ والوں کو لکھ رہا ہوں، لیکن وہاں خاموشی ہے، وہ

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں — واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

والا معاملہ ہے۔ حالانکہ ہماری یونیورسٹی جامعہ امام محمد بن سعود (ریاض) کو ساڑھے سات فیصد ROYALTY (رائلٹی) بھی دینے کو تیار ہے۔

مولوی حبیب الرحمن اعظمی مرحوم کا ایک خط لف ہذا ہے۔ اسے معارف کی کسی اشاعت میں شامل کر دیں۔

فقط والسلام

نیازمند (شیخ) نذیر حسین

مکاتیب شبلی اول و دوم

علامہ شبلیؒ کے دوستوں، عزیزوں، شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ جس میں مولانا کے قومی خیالات اور علمی و تعلیمی اور ادبی نکات ہیں۔

قیمت اول ...۴۰، دوم ...۴۰

بہ ید فرنگ

مولانا سید سلیمان ندوی کے ان خطوط کا مجموعہ جو انھوں نے یورپ سے لکھے۔ قیمت ۲۵ روپے

مشاہیر کے خطوط

اس میں مولانا سید سلیمان ندوی کے نام مولانا حالی، اکبر الہ آبادی، مہدی افادی، عماد الملک، مولانا محمد علی، علامہ اقبال اور مولانا شروانی و مولانا آزاد کے خطوط جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ...۳۵

وفیات

مولانا نجم الدین اصلاحی

۱۴ اگست کو حافظ مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی نے تقریباً ۹۴ برس کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۰

انھوں نے اپنے جد بزرگوار ملا قدرت علی مرحوم سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور اپنے گاؤں ہی کے ایک دوسرے بزرگ حافظ عبدالرحیم مرحوم کی خدمت میں رہکر قرآن مجید حفظ کیا، مزید تعلیم مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں ہوئی، اس وقت مدرسہ میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب تدبر قرآن اور مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم سابق مہتمم مدرسۃ الاصلاح بھی زیر تعلیم تھے۔ فارسی میں مولانا نجم الدین صاحب کی اچھی اور پختہ استعداد ان کے ہم وطن مولوی محمد مصطفٰے صاحب کے فیض تلمذ کا نتیجہ تھی۔ جو مدرسۃ الاصلاح میں فارسی کے بہت اچھے اور لایق معلم تھے۔ اس زمانے میں مولانا شبلی متکلم ندوی مدرسۃ الاصلاح سرائمیر کے مہتمم تھے، وہ علامہ شبلیؒ کے تلمیذ رشید اور اس مجلس اخوان الصفا کے ایک رکن تھے جو علامہ مرحوم کی وفات کے بعد انکے ناتمام کاموں کی تکمیل کے لیے مولانا حمید الدین فراہیؒ کی سربراہی میں قائم ہوئی تھی مولانا شبلی متکلم معقولات اور اسرار شریعت کی کتابوں کا درس اس شان سے دیتے تھے کہ طلبہ کو مطالب بخوبی ذہن نشین ہو جاتے تھے۔ مدرسہ کا معیار تعلیم بلند اور بہتر بنانے کے لیے ان کو دوبارہ مدرسہ کی خدمت کی زحمت دی گئی تو بڑھاپے میں بھی

ان کے درس کا وہی رنگ رہا، اس کی شہادت مولانا نجم الدین صاحب نے اس طرح دی کہ وہ چپکے سے جنگلے کے پاس جاکر درس سنا کرتے تھے۔ انکے علاوہ مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی، مولانا حکیم محمد احمد لہراوی اور دوسرے اساتذہ سے بھی درسیات کی تکمیل کی، ۱۹۱۷ء میں جب مولانا حمید الدین فراہیؒ دار العلوم حیدرآباد کی پرنسپلی سے استعفا دے کر مدرسۃ الاصلاح کے بوریائے فقر پر فروکش ہوئے تو وہ اپنے نہج پر یہاں کے اساتذہ اور منتہی طلبہ کو قرآن مجید پڑھاتے تھے، مولانا نجم الدین صاحب ان کے درس میں شریک ہوتے اور حافظ ہونے کی بنا پر قرأت بھی کرتے تھے۔ اس وقت اس نواح کے ممتاز اور نامور عالم مولانا ماجد علی مانوی جونپوری کے درس حدیث کی بڑی شہرت تھی، مولانا نجم الدین صاحب اس سے بھی فیضیاب ہوئے۔

رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے مدرسۃ الاصلاح میں تدریس کی خدمت انجام دی، وہ ہونہار اور ذہین طلبہ کی بڑی حوصلہ افزائی کرتے تھے جماعت اسلامی کے مشہور اہل قلم مولانا صدر الدین اصلاحی کی تربیت میں ان کا بڑا ہاتھ تھا، مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی سابق امیر جماعت اسلامی ہند نے بھی ان سے بعض کتابیں پڑھی تھیں۔

۱۹۴۳ء میں وہ سدھاری اعظم گڈھ تشریف لائے اور پھر یہیں کے ہو رہے، مگر ۱۹۷۱ء میں کبرسنی کیوجہ سے وہ اپنے گھر بھا پر رہنے لگے۔

مولانا نجم الدین صاحب کا گھرانہ دیندار تھا اور خود ان کا رجحان بھی شروع سے صلحا و اتقیا کی جانب تھا، ان کے بچپن اور جوانی میں مولانا سید محمد امین نصیر آبادی اپنے اصلاحی و تبلیغی مشن کے سلسلے میں اعظم گڈھ تشریف لاتے تھے اور یہاں سے

قصبوں اور دیہاتوں میں انکا وعظ ہوتا تھا اس کی وجہ سے یہاں انکے ہزاروں معتقدین و مریدین تھے، راجہ پور سکرور ان کا خاص تبلیغی مرکز تھا اور وہ یہاں کئی کئی روز قیام کرتے تھے، مولانا نجم الدین صاحب ان کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ "یادگار سلف" کے نام سے ان پر ایک کتاب تالیف کی جس کو پڑھنے سے آج بھی ایمانی حرارت پیدا ہوتی ہے، مولانا سید امین صاحب کی ذات گرامی ان کے لیے اس بنا پر بھی نہایت پرکشش تھی کہ وہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے دودمان عالی سے تعلق رکھتے تھے جس کے ہر ہر فرد سے وہ غیر معمولی عقیدت رکھتے تھے، اپنی یہ کتاب اسی مقدس خانوادۂ علم وارشاد کے ایک قابل احترام بزرگ مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی ندوی سابق ناظم ندوۃ العلماء کے نام سے معنون کی تھی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے جو ان سے سن و سال میں چھوٹے تھے عقیدت واحترام کا یہی معاملہ تھا، مولانا بھی ان کا بڑا اکرام کرتے تھے اور اعظم گڈھ تشریف لاتے تو ان کے گھر بھی جاتے۔

مولانا نجم الدین صاحب دارالمصنفین سے بھی بڑا تعلق رکھتے تھے، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود علی ندوی اور تمام رفقائے دارالمصنفین سے ان کے اچھے تعلقات تھے، مولانا سید سلیمان ندوی کے علم و فضل کے بڑے معترف تھے، جب تک قوت رہی برابر دارالمصنفین تشریف لاتے رہے، انتقال سے چند برس پہلے مجھے خط لکھا کہ تم سے ملنے کا بہت جی چاہتا ہے لیکن میرے پیروں میں طاقت نہیں رہی، میں حاضر ہوا تو بڑی محبت و شفقت سے پیش آئے اور دو تین گھنٹوں کی صحبت میں ماضی کے اوراق الٹتے رہے۔

اس صدی کی چوتھی دہائی میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے متکلمانہ

اور دل و دماغ کو جھنجھوڑ دینے والے موثر مضامین نے بھی ان کو اپنی جانب مائل کیا، مولانا نے انہی کی دعوت پر سرائمیر کا سفر کیا اور ان کے گھر بھی تشریف لے گئے، اسی زمانے میں انھوں نے دلائل السنن والآثار کے نام سے ایک اہم مضمون لکھا جو مولانا مودودی کے رسالہ ترجمان القرآن کے کئی نمبروں میں شایع ہوا اور بعد میں کتابی صورت میں بھی چھپا، لیکن رفتہ رفتہ مولانا سے ان کے تعلقات کم ہوتے گئے اور وہ انکی جماعت کی مخالفت میں پیش پیش رہنے لگے۔

مولانا نجم الدین صاحب کی عقیدت و نیاز کا اصل مرکز مولانا حمید الدین فراہیؒ اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ تھے، جن کو تدین و تقویٰ اور سیرت و اخلاق میں وہ صحابۂ کرام کا نمونہ کہتے تھے، اول الذکر انکے استاد تھے اور انکے زہد و اتقا کی طرح علم و فضل کے بھی بڑے معترف تھے اور موخرالذکر سے بیعت وارشاد کا تعلق تھا، ان دونوں بزرگوں کا ذکر کرتے تو ان پر عجیب کیفیت طاری ہوجاتی، ایک مرتبہ کہنے لگے ان دونوں سے زیادہ پاکیزہ اور حسین زندگی نہیں دیکھی، مولانا مدنی پر ان کے متعدد مضامین شایع ہوئے اور انھوں نے کئی برسوں کی محنت شاقہ کے بعد انکے مکاتیب جمع کرکے اپنے مفید حواشی کے ساتھ چار جلدوں میں شایع کیا جو انکا بڑا کارنامہ ہے، چند برس پہلے ان کی آخری کتاب "سیرت شیخ الاسلام" چھپی تھی، مولانا مدنی کی یادگار میں دیوبند سے ماہنامہ تذکرہ کا اجرا ہوا تو اس کی ادارت انہی کو سپرد کی گئی۔

مولانا مدنیؒ بھی اپنے مسترشد کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کی دعوت پر راجہ پور سکرور تشریف لاتے اور اہل قریہ اور قرب وجوار کے لوگوں کو مستفیض فرماتے، مولانا ہی کے ایما سے حکومت نے انکا ماہانہ وظیفہ جاری کر دیا تھا، وہ کہتے تھے کہ مجھے جب کبھی سدھاری چھوڑنے کا خیال ہوتا تو حضرت کا اشارہ نہ پاکر اپنا ارادہ تبدیل

کر دیتا تھا، یہ دعائے مدنی کا فیض ہے کہ اللہ نے اس اچھے حال میں کر دیا۔

مولانا ابو الکلام آزادؒ سے بھی ان کو خاص تعلق رہا اور ان کے ایما سے مولانا روم کی رباعیات کا ایک انتخاب شایع کیا جس کے شروع میں ان کے حالات بھی فارسی میں لکھے تھے۔

ان کی بعض کتابیں وسائل و ذرایع کی کمی کی بنا پر تکمیل و اشاعت سے محروم رہیں، دلائل القرآن کے بعض حصے برہان دہلی میں شایع ہوئے، وہ تفسیر ابن جریر کا ملتقط بھی شایع کرنا چاہتے تھے، جس کا کچھ حصہ مجلہ الحج مکہ میں چھپا تھا، لیکن غالباً مکمل نہیں ہو سکا، ایک مرتبہ کہنے لگے کہ استاذ امام مولانا فراہیؒ نے فرمایا تھا کہ تفسیر ابن جریر سے اگر "اولی الاقوال عندی" کو جمع کر دیا جائے تو ایک بہترین تفسیر ہو جائے گی۔

مولانا نجم الدین صاحب مدۃ العمر علم و دین کی خدمت اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے، ان کی زندگی سادہ اور فقیرانہ تھی، صبر و قناعت کے خوگر اور حرص و طمع سے دور رہتے، دینی حمیت کی وجہ سے غیر مشروع اعمال و اشغال پر برہم ہو جاتے۔ جن چیزوں کو صحیح سمجھتے تھے انکا اظہار بے باکی سے کر دیتے اور حکمت و مصلحت اور موقع و محل کی پروا نہ کرتے، زود رنج تھے، اختلاف رائے کو انگیز نہیں کر سکتے تھے۔ مزاج میں شدت و انتہا پسندی اور طبیعت میں طیش و اشتعال تھا اس لیے غصے میں بے قابو ہو جاتے اور اعتدال پر قائم نہیں رہتے، جو کچھ زبان پر آتا یہانتک کہ ناروا اور ناگفتنی بھی کہہ دیتے تھے، تحریر بھی بے اعتدالی سے خالی نہیں ہوتی تھی، اسی لیے اکثر لوگوں سے انکی ان بن ہو جاتی تھی مگر خود انکا غصہ دیرپا نہ ہوتا تھا، اللہ تعالیٰ انکی مغفرت فرمائے اور بشری لغزشوں کو معاف کرے۔

"ض"

ادبیات

بہ حضورِ رسالت مآب ﷺ

از جناب مقصود احمد مقصودؔ بڑودہ

پختہ دلِ مراد کا سودائے خام ہو — صبح و مسا تصورِ خیر الانام ہو

تنہائیوں کے غار میں ہے معتکف خیال — موصول پھر کوئی مرے دل کو پیام ہو

بے سایہ ایک دشتِ لق و دق ہوں میں شہا — مجھ پر سحابِ چشمِ عنایت مدام ہو

ہوش و خرد کی محفلِ بے کیف میں مجھے — عرفان و آگہی کا عطا کوئی جام ہو

پژمردہ و خمیدہ ہیں، پودے یقین کے — پھر کشتِ اعتقاد پہ بارانِ عام ہو

اے کاش میری چشمِ تمنائے انتظار — دیدارِ مصطفیٰؐ سے ذرا سیر کام ہو

شاہانِ وقت نے بھی یہی کی ہے آرزو — شامل درِ نبی کے غلاموں میں نام ہو

یعنی چراغِ مصطفوی کی شعاع سے — روشن شبِ حیات کا سارا نظام ہو

عمرِ رواں کا مہرِ درخشاں ہو جب غروب — رشکِ سحر وصال مقدس کی شام ہو

شانِ رسولؐ پاک کے شایاں کبھی ادا — کیونکر فریضۂ ادب و احترام ہو

ہے سرنگوں وجود نہایت ادب کے ساتھ
مقصودؔ کا قبول ہدیۂ دیں، سلام ہو

نعت پاک ﷺ

از جناب فاخر جلال پوری۔

مجھے یہ مال و زر کیا تختِ دارا و سکندر کیا — شہِ بطحا کا ادنیٰ امتی ہوں اس سے بڑھکر کیا

مقاماتِ شہِ لولاک کی رفعت کا اندازہ — لگا پائیں گے جبریلِ امیں کے بازوئے پر کیا

مرے آقا کا فیضانِ کرم سب کے لیے یکساں — نگاہِ رحمتِ عالم میں کمتر اور برتر کیا

حرم کی شام اور صبحِ مدینہ جس نے دیکھی ہو — بہارِ خلد کا اس کی نظر میں کوئی منظر کیا

شرف ان کی غلامی کا میسر ہو جسے فاخر
نگاہوں میں پھر اسکی سطوتِ کسریٰ و قیصر کیا

غزل

از جناب وارث ریاضی صاحب مغربی چمپارن

گذرتے ہیں کیسے الم کے زمانے؟ — بجز صاحبِ غم، یہ کوئی نہ جانے

نہ ہوگا جہانِ محبت میں رسوا — تہِ دل سے جو بھی مری بات مانے

زہے مہرباں! آپ تشریف لائے — دمِ واپسیں ظرفِ دل آزمانے

کلی کی حقیقت ہے میری حقیقت — گلوں کے فسانے ہیں میرے فسانے

ہمیں اس نے بھیجا ہے خلدِ بریں سے — علوم و معارف کی دنیا بسانے

تجھے پا کے پہلے سے بھی مضطرب ہوں — فزوں کر دیا غم کو غم کی دوا نے

غمِ زندگی کے خزانے کا مجھ کو — نگہباں بنایا ہے میرے خدا نے

وفا جُستن در عالمِ بے مروت — صد افسوس بر دانشِ آں جوانے

وہاں کوئی امیدِ انصاف کیسی؟ — جہاں ضد میں سچ کو کوئی سچ نہ مانے

نہ مسجد رہے گی نہ مندر رہے گا!! — جو دل ٹوٹ جائے تو کیا ہو نہ جانے

حقائق سے صرفِ نظر کر کے وارثؔ
گڑھے جا رہے ہیں ہزاروں فسانے

مطبوعاتِ جدیدہ

مآثرِ امام اعظم مرتبہ حکیم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۸۰، قیمت ۵۰؍روپے، پتہ مکتبہ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ

حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ پر اردو میں متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور ابھی تک اس کا سلسلہ جاری ہے، ان کی مسلّمہ عظمت و بلند پائیگی کے باوجود شروع ہی سے محدثین کا ایک طبقہ ناواقفیت کی بنا پر امام صاحب پر بے جا نکتہ چینی کرتا رہا ہے، جس کا مدلل جواب دیا جا چکا ہے لیکن اب بھی بعض حلقوں سے وہی فرسودہ اور لغو اعتراضات دہرائے جا رہے ہیں، اس لیے مصنف نے امام صاحب پر بیجا اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے اور ان کے سیاسی و کلامی نظریات، اخلاق و معاملات کی صفائی اور فقہ حنفی کے امتیازات بھی بیان کیے ہیں، آخر میں ان کے جلیل القدر اصحاب و تلامذہ اور مسند ابو حنیفہ پر اچھی بحث و گفتگو کی ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب گوناگوں فوائد و معلومات پر مشتمل ہے، لیکن مصنف کے ذہن کے انتشار اور خیال کی بے ربطی کی وجہ سے کتاب میں بھی بے ترتیبی و بے ربطی پائی جاتی ہے۔ پھیلے ہوئے مواد و معلومات کو سمیٹ کر نہ لکھنے کی وجہ سے جا بجا طوالت، تکرار اور الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے، زبان و بیان میں بھی خامی و ناہمواری ہے، تشیع، اعتزال، ارجاء، جبر و قدر اور جہمیت سے امام صاحب کی برأت کے لیے ان فرقوں کی مکمل تاریخ بیان کر کے بلا ضرورت کتاب کا حجم بڑھایا گیا ہے، زبان و بیان پر قابو نہ ہونے کی وجہ سے حدود و مراتب کا لحاظ

بھی نہیں کیا گیا ہے شلاً "جب حضرت عثمانؓ کو امیر المومنین بنایا گیا تو حضرت علیؓ،
ان کے رفقا و اعوان بپھر پڑے، ان کا غصہ اور بھی تیز ہوگیا" امام صاحب کی مدافعت
کا حق دوسروں کی تنقیص کے بغیر بھی ادا ہوسکتا تھا مثلاً "آج کے وہابی اگرچہ تعلیمات
کے اعتبار سے مختلف ہیں مگر سادگی میں انہیں (خوارج) جیسے ہیں"۔ عربی کے اوق
الفاظ کے ساتھ ہیاؤ جیسے پوربی اور اودھی لفظ اور خواہ مخواہ انگریزی الفاظ
کا استعمال معیوب ہے جیسے "امام اعظم کو چیف کنٹرولر وزارت مالیات چیف جسٹس جیسے
گرامی عہدے پیش کیے" اور "امام صاحب احادیث کو اخبار کی خبر نہیں بنانا چاہتے تھے
بلکہ ایڈیٹوریل نوٹ بنا کر دکھانا چاہتے تھے۔۔۔" "علقمہ گویا ابن مسعودؓ کی ٹرو کاپی تھے"
بعض الفاظ کا مفہوم بھی دشوار ہے شلاً "کاجلوں کی کوٹھری" کہیں غرابت ہے جیسے
خرانی نرم گوشگی، عینا کی کہیں ثقاہت و شائستگی کا سررشتہ چھوٹ گیا ہے جیسے
شیعیت اسلام کے لیے جذام، گرو گھنٹال، امام بخاری بھی پانچوں سواروں میں وغیرہ،
بعض ذیلی سرخیاں پُرلطف اور شاعرانہ رنگ میں ہیں لیکن یہ رنگ کہیں چھچھا بھی
ہے جیسے "عباسی دورِ حکومت کا وجود۔۔۔ اموی حکومت کا زوال بھی آپ کے نگہ
نیم باز کا کرشمہ تھا" بعض جگہ حوالوں کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے جیسے "خوارج کی سب
سے مضبوط اور محکم رائے یہ تھی کہ خلیفہ الیکشن کے ذریعہ ہونا چاہیے جو بالغ آزاد رائے
دہندگی پر مشتمل ہو"، ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "چنانچہ حافظ نے لکھا ہے" یہ حافظ کون
ہیں؟ علمی و تحقیقی مباحث میں ظن و تخمین پر مبنی الفاظ "غالباً"، "اگر" اور "ظاہر ہے" کا
عیب ظاہر ہے، خطیبانہ و مدرسانہ رنگ بھی نمایاں ہے شلاً فقہ تقدیری کے جواز
و عدم جواز کی بحث کرنے والے سن لیں۔۔۔" ان خامیوں کے باوجود کتاب سے

مصنف کی ذہانت، محنت، جانفشانی اور وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے، اور یہ قدر
کے لائق ہے۔ اس کتاب کی اشاعت اردو کے ذخیرہ میں ایک مفید اضافہ ہے۔

مہرانِ نقش از جناب ڈاکٹر وفا راشدی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ اور
کتابت و طباعت، مجلد مع خوبصورت گردپوش، صفحات ۲۳۲، قیمت ۵۰ روپے،
پتہ: مکتبہ اشاعت اردو، ایف/۲۷، ٹی اینڈ ٹی کالونی، ملیر ہالٹ، کراچی ۲۷۔

وادیٔ سندھ صدیوں سے تہذیب و ثقافت اور زبان و ادب کے کاروانوں کی
رہگذر اور منزل رہی ہے، باب الاسلام ہونے کی برکت سے یہ خطہ اسلام کے ابر کرم سے
سب سے پہلے سیراب ہوا، وہاں کے آثار تاریخ اور زبان و ادب میں اب تک اسی کی سرسبزی
و شادابی جھلکتی ہے، فاضل مولف نے اس کتاب میں سندھی، فارسی اور اردو ادب کے
چند نقوش اس سلیقہ سے جمع کردیے ہیں کہ سندھ کی پوری ادبی تاریخ کا احاطہ ہوگیا ہے،
ایک حصہ میں طلوع اسلام سے انگریزی حکومت کے غروب آفتاب تک سندھی ادب کا
تاریخی جائزہ ہے اور ایک مضمون میں خاص طور پر مشہور صوفی شاعر شاہ لطیف کے کلام،
معرفت اور پیام محبت کی ترجمانی کی گئی ہے جس کا مطالعہ سندھ کے نفرت و تشدد کے موجودہ
حالات میں نہایت مفید اور ضروری ہے، اردو ادب کے سلسلہ میں وہاں کے چند نامور
اردو شعرا پر تحقیقی مضامین ہیں، ایک مضمون میں فاضل مولف نے مولانا سید سلیمان ندوی
کی اس تحقیق کو برحق بتایا ہے کہ اردو کا مولد سندھ ہی ہے، ایک اور باب میں لعل شہباز قلندر،
سچل، فقیر بیدل اور خواجہ حسن جان سرہندی کے فارسی کلام کے جائزہ کے علاوہ سندھ کے
چند ارباب فضل و کمال کا تذکرہ بھی ہے، فاضل مولف اس سے پہلے اپنی عمدہ تصنیف
"بنگال میں اردو" کے ذریعہ اہل نظر سے داد و تحسین حاصل کرچکے ہیں، مہران نقش ان کی علمی

فتوحات میں ایک اور قیمتی اضافہ ہے۔

ایرانی تصوف از جناب پروفیسر کبیر احمد جائسی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۱۶، قیمت ۸۰ روپے، پتہ: پبلی کیشنز ڈویژن، اے، ایم، یو علی گڑھ

پروفیسر کبیر احمد جائسی کی ایران شناسی اور ادبیات فارسی سے ان کی دلچسپی اب محتاج تعارف نہیں، فارسی کے دور جدید کے کئی متعدد ادیبوں اور شاعروں کا تعارف اردو میں ان ہی کے ذریعہ ہوا، اب انھوں نے ایران کے مشہور محقق اہل قلم اور علی گڑھ کے ادارہ علوم اسلامیہ کے سابق استاد سعید نفیسی مرحوم کی کتاب "سرچشمہ تصوف در ایران" کی تلخیص پیش کی ہے اور اس مقبول کتاب کو کتاب دل کی ایک تفسیر شمار کرتے ہوئے اسکے ماله وما علیه سے آگاہ کیا ہے، آج کل کی زبان میں تصوف ایک ایسا متنازعہ موضوع ہے جس کی جنم بھومی میں شدید اختلاف رائے ہے، اسلامی تصوف کی بنیاد احسان و تزکیہ کے واضح اصول پر بتائی جاتی ہے اور اس کے سلاسل کا تعلق قرن اول کے سرچشمہ صافی سے ثابت کیا جاتا ہے، یہ صحیح ہے کہ یہ سلاسل ایران و عراق کی راہ سے ہو کر گزرے ہیں اور تدریجاً وہاں کی آب و ہوا سے متاثر بھی ہوئے ہیں، لیکن اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ایرانی تصوف کا سرچشمہ اسلام کے بجائے بودھ مت ہے اور یہ اصلاً عربوں کے اقتدار کے خلاف شعوبی تحریک کے نتیجہ میں سامنے آیا ہے، محل اختلاف کے باوجود نفیسی کے دلائل و نظریات میں غور و فکر کا سامان ہے اور ان کو صرف یہ کہہ کر نظر انداز کر دینا آسان نہیں کہ وہ ایران گردمی یا ایران پرستی کی نفسیات کا شکار ہیں، فاضل تلخیص نگار نے تلخیص و ترجمانی کا فریضہ اس خوبی سے انجام دیا ہے کہ بیشتر مباحث کا احاطہ ہوگیا ہے بعض سخت

مقامات پر رائے ظاہر کی ہے لیکن احتیاط کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، اگر کتاب کا مکمل ترجمہ کر دیا جاتا تو براہ راست واقفیت، استفادہ اور استغناء دونوں کے لیے کارآمد ہوتی۔

ہندوستان میں فلسفہ خودی کا ارتقا از جناب نشور واحدی مرحوم، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۲۹، قیمت ۶۰ روپے، پتہ: دانش محل، امین آباد لکھنؤ، اور نیاز واحدی ۹۵/۱۴۳ ناظر باغ، کانپور۔

نشور واحدی مرحوم کی شہرت ان کی پاکیزہ اور بلند پایہ شاعری کے سبب ہے، معارف میں ایک عرصہ تک ان کا کلام "شور نشور" کے عنوان سے شایع ہوتا رہا، ان کا کلام صوفیانہ اور فلسفیانہ تجلیات سے گرم و منور ہے، تصوف سے انکا عملی تعلق تھا فلسفہ سے ان کے شغف کی دلیل ان کی کتاب تاریخ فلسفہ خودی ہے جس کی پذیرائی اہل نظر نے کی، زیر نظر کتاب بھی گویا اسی کا ایک اور حصہ ہے، اس میں ویدک عہد بلکہ اس سے بھی قبل سے علامہ اقبال تک ہندوستان کے مختلف مذاہب اور ارباب فکر و دانش کے فلسفہ خودی کی تعبیر و تشریح کی تاریخ بیان کر دی گئی ہے، اختصار کے باوجود جامعیت کی خوبی کہیں کم نہیں ہے، مولف مرحوم کی نثر ان کی شاعری کی طرح دلکش ہے ایک دو جگہ عبارتوں کی تصحیح رہ گئی ہے جیسے "موجودہ ہندو مذہب کل کا کل آرین تہذیب سے نکلی ہے" آتما کو ایک جگہ تذکیر کے ساتھ لائے ہیں تو چند سطروں کے بعد ہی اسے صیغۂ تانیث میں بھی استعمال کیا ہے، مولانا حمید الدین بھریادی کے بجائے معروف نسبت فراہی لکھنا بہتر تھا، کتاب میں مولف کے متعلق پروفیسر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی تحریریں بھی شامل ہیں۔

مکتوبات مہاجر مدینہ مولانا محمد عبدالملک جامعی مرحوم

مرتب، جناب افتخار احمد فریدی، صفحات ۸۹، قیمت ۱۵ روپے، پتہ: کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔

مولانا جامعی صاحب دل بزرگ اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے جذبہ سے سرشار تھے ان کے یہ مکتوبات اسی تڑپ کے ترجمان ہیں اور دل پر خاص اثر کرتے ہیں۔

مشاہیر کے خطوط بنام حضرت العلامہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مرتب محمد یسین گوپر گانوی، صفحات ۸۰، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ۔

جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتابوں اور دوسرے اخبارات و رسائل میں ان کے نام مشاہیر ہند کے خطوط خاصی تعداد میں موجود ہیں، ان متفرق علمی و ادبی جواہر ریزوں کو مرتب نے سلیقہ سے جمع کر دیا ہے اور مکتوب نگاروں کے مختصر تعارف اور چند مفید حواشی سے بھی آراستہ کیا ہے۔

ہند اسلامی تہذیب مترجم جناب لیاقت علی، صفحات ۸۴، قیمت و پتہ درج نہیں۔

مسلم یونیورسٹی کے ثانوی درجات کے نصاب میں ایک انگریزی کتاب انڈو اسلامک کلچر بھی ہے، اس میں ہندوستانی تہذیب پر مسلمانوں کے اثرات کو خوبی سے بیان کیا گیا ہے، مذہبی منافرت کے اس دور میں طلبہ کے لیے یہ بڑی متوازن کتاب ہے، اب اردو داں طلبہ اور دوسرے قارئین کے لیے اسکا ترجمہ کر دیا گیا ہے جو سلیس و رواں ہے اور کتابت و طباعت بھی اعلیٰ معیار کی ہے۔

ع۔ ص۔

تصنیفات علامہ شبلیؒ و علامہ سید سلیمان ندویؒ

علامہ شبلیؒ	قیمت	علامہ سید سلیمان ندویؒ	قیمت
سیرۃ النبیؐ اول	۶۵۔۰۰	سیرۃ النبیؐ سوم	۱۲۵۔۰۰
" دوم	۵۰۔۰۰	" چہارم	۱۲۵۔۰۰
الفاروق	۹۵۔۰۰	" پنجم	۶۰۔۰۰
المامون	۵۰۔۰۰	" ششم	۱۲۵۔۰۰
الکلام	۵۰۔۰۰	" ہفتم	۳۵۔۰۰
علم الکلام	۳۵۔۰۰	خطبات مدراس	۲۵۔۰۰
اسلام اور مستشرقین چہارم	۴۰۔۰۰	الرسالۃ المحمدیہ (ترجمہ خطبات مدراس عربی)	۴۰۔۰۰
شعرالعجم اول	۴۰۔۰۰	رحمت عالم	۱۰۔۰۰
" دوم	۳۵۔۰۰	تاریخ ارض القرآن دوم	۳۰۔۰۰
" سوم	۲۵۔۰۰	عرب و ہند کے تعلقات	۷۵۔۰۰
" چہارم	۳۵۔۰۰	سیرت عائشہؓ	۴۰۔۰۰
" پنجم	۲۵۔۰۰	حیات شبلیؒ	۹۰۔۰۰
کلیات شبلی اردو	۲۵۔۰۰	یاد رفتگاں	۵۰۔۰۰
مکاتیب شبلی اول	۴۰۔۰۰	رسالہ اہلسنت والجماعت	۱۰۔۰۰
" " دوم	۳۰۔۰۰	اسلام اور مستشرقین پنجم	۲۵۔۰۰
مقالات شبلی (مکمل سیٹ)	۲۲۰۔۰۰	دروس الادب اول	۵۔۰۰
		دوم	۵۔۰۰
خطبات شبلی	۲۵۔۰۰	شذرات سلیمانی	۴۵۔۰۰
		برید فرنگ	۲۵۔۰۰
انتخابات شبلی	۲۵۔۰۰	نقوش سلیمانی	۶۰۔۰۰
		خیام	۶۵۔۰۰
۔۔۔۔۔۔	۔۔۔۔	مقالات سلیمان سوم	۴۵۔۰۰